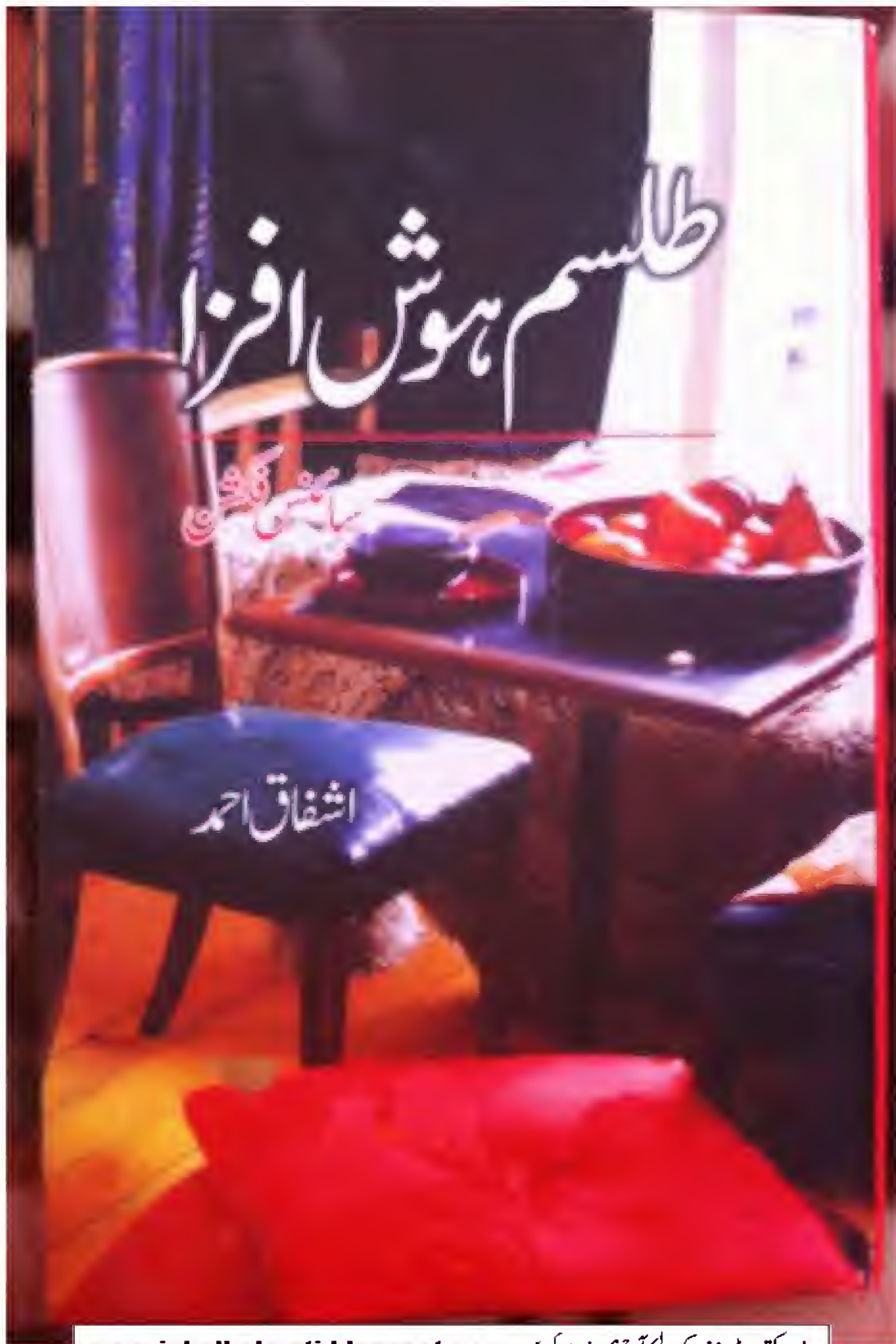

طلسم ہوش افزا
اشفاق احمد

طلسم ہوش افزا

سائنس فکشن

اشفاق احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

فہرست

اردو کی سب سے عظیم اور قدیم سائنس فکشن
طلسمِ ہوشربا کے نام

قصاص

شام کے ٹھیک پانچ بجے موبے کلیام سے چل کر جب دونوں بھائی پنو کی پہنچے تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور سردیوں کی شام گہری ہونے لگی تھی۔ انہوں نے سیون اپ کی ایک ایک بوتل میں آدھی آدھی چمچی کالے لون کی ڈالی اور بوتل کے منہ پر انگوٹھا رکھ کے اسے اپنے اپنے منہ میں جکڑ بند کر لیا۔ دونوں بھائیوں نے اُبلتے ہوئے پانی کا ایک قطرہ بھی باہر نہ نکلنے دیا اور بڑی صفائی کے ساتھ اپنی اپنی بوتل پی گئے۔

سابو اور دیبو دونوں سگے بھائی نہ تھے، چاچے تائے کی اولاد تھے لیکن دونوں میں سگے بھائیوں سے بھی زیادہ پیار تھا۔ ایک سے رنگ کے کپڑے پہنتے، ایک جیسی سندھی ٹوپی اوڑھتے۔ دونوں پھڈی جوتی اور لانگڑ کھینچ کے چادر باندھتے تھے۔ دونوں ہونٹوں پر ملائی مل کے..... آنکھوں میں لال سرمہ ڈالتے تھے اور دونوں موبے کلیام کی ایک ہی عورت کے عاشق تھے۔

یہ عورت ذات کی بورئن تھی اور سانڈے کا تیل بیچتی تھی۔ سردارنیوں کی مالش کرتی تھی اور سرداروں سے مالش کرواتی تھی۔ سابو اور دیبو اس کو بہت اچھا جانتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے دل میں کوئی میل نہیں تھا۔ ویسے بھی ان کے دلوں میں کوئی خندق نہیں تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی دوستیاں اور دشمنیاں سانجھی تھیں۔ دوستی تو خیر ان کی ایک ہی تھی اور آپس کی تھی لیکن دشمنیاں کافی تھیں۔ اسی لئے وہ سفر میں اور حضر میں ایک نو برنو بردا ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ اور یہ بردا ایک کلاشنکوف ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور تینوں ایک ہی وقت میں ایک ہی لینڈرو ور میں

سفر کرتے تھے۔

جس شام وہ پتوکی سے لاہور کی طرف چلے ہیں تو راستے میں میل بھر کے ٹوٹے پر بارش ہوئی۔ پھر موسم بالکل صاف ہو گیا۔ سابو نے دینو سے کہا "تایا غلام غوث کبھی کبھی کرتار سنگھ بلوچے کا قصہ سنایا کرتے تھے تو سماں باندھ دیتے تھے۔"

دینو نے کہا "ابے نے مجھے اور بھائی کرم داد کو صرف دو مرتبہ یہ قصہ سنایا تھا لیکن تمہارے گھر آ کر وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اصل میں ان کو اپنی اولاد سے زیادہ اپنے بھائی کے بچوں سے پیار تھا۔"

سابو نے کہا "خیر یہ تو حقی سچی بات ہے۔ تایا غلام غوث ہم سب سے بڑی محبت کرتے تھے اور یہ محبت ہمارے ابے کی وجہ سے تھی۔ ان کو اپنا چھوٹا بھائی اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پیارا تھا۔"

دینو نے اپنے چچا زاد بھائی کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور اونچی آواز میں ایک واہیات قسم کا نعرہ لگا کر بولا "یہ ساری محبت کی کھیتیاں ہیں جن کو عشق کے پانی سیراب کر رہے ہیں بھاء! پر آگے کا علم نہیں کہ ہماری اولادوں میں بھی ایسی محبت رہتی ہے کہ نہیں۔"

"ضرور ضرور" پیچھے بیٹھا ہوا گولا بولا "جن کے بڑوں میں محبت ہوتی ہے، ان کے چھوٹے بھی عشق کے جھونٹے لیتے ہیں۔"

سابو نے کہا "اوئے داریا! تمہارے گھرانے میں بھی کبھی ہوئی ایسی محبت، ہم بھائیوں جیسی؟ یا ہمارے وڈکوں جیسی یا ہمارے پرانے پرکھوں جیسی جب ہم ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔"

دارا کچھ شرما سا گیا اور بھاگتی ہوئی لینڈ روور کے باہر دیکھ کر بولا "میرے دو نانوں میں ایسی محبت ضرور تھی، پر میں نے ان کو دیکھا نہیں۔"

دینو نے چٹک کر کہا "لکھ لعنت اوئے داریا! کبھی نانا بھی کسی کی جد پشت میں شمار ہوا ہے۔ نانکے بھی شجرے کھتونی، جمیعندی میں آئے ہیں کبھی! دادے لوگاں کی بات کر..... اونچے، لمبے سورمیاں کی۔ نانا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔"

دارا نے کلاشنکوف پر پھونک مارتے ہوئے ہولے سے کہا "ٹھیک ہے بھئی

چوہدریا، ٹھیک ہے۔ جد پشت میں تو آخر تک دادے کا لہو اور دادے کی رت ای چلتی ہے۔ نانا تو پہلے سٹیشن پر ہی اتر جاتا ہے۔"

دونوں بھائی ہنسنے لگے تو آگے پھر میل بھر کا دھواں دھار ٹوٹا آ گیا۔ بارش ہوئی نہیں تھی، پر تلی کھڑی تھی۔ کالا سیاہ سمندر بڑی ساری پکھال میں بھرا درختوں سے اوپر چھلک رہا تھا اور کسی بھی گھڑی اس کے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ لاہور ابھی کافی دور تھا۔

سابو نے کہا "میرا تایا سنایا کرتا تھا کہ ایسی ہی کالی رات تھی اور اسی طرح آسمان نے مینہ کا پرنالہ روک رکھا تھا جب سجن سنگھ بلٹوہیئے کا بیٹا کرتار سنگھ گھر سے روانہ ہوا ہے۔ ماں نے کہا بھی کہ..... کاکا کل سویرے چاہے منہ اندھیرے نکل جانا پر اس وقت نہ جا۔ بوند بارش کا موسم ہے، جھڑی لگ گئی تو راستے میں ایک ہی بیڑ ہے۔ وہاں رُک بھی گیا تو تیری گھوڑی نہیں اٹکے گی۔ چار بھنیئر ناگوں کی راجدھانی میں بڑے بڑے راٹھ گھوڑے نہیں ٹھہر سکے۔ تیری گھوڑی تو پھر ابھی الھڑ بچھیری ہے، بدک کر تیری جانگھوں سے نکل جائے گی۔ کل سویرے سویرے چلے جانا اور دوپہر سے پہلے پہلے اپنے ماما کے پاس پہنچ جانا..... کرتار سنگھ نے اپنی ماں کی بات سنی ان سنی کر دی اور کالی نتنی پر کاٹھی ڈال کر لمبے پینڈے کے لئے تیار ہو گیا۔"

سابو نے کہا "میں نے کرتار سنگھ کی تصویر دیکھی تھی۔ اس میں وہ موت کے گولے میں موٹر سیکل چلانے والے کی ساتھی لڑکی نظر آتا تھا۔ منہ پر ہلکی ہلکی داڑھی جو کانوں کے پاس جا کر گہری ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ، پگڑی کے اوپر کھانڈے کا نشان، ہونٹ بہت ہی باریک اور ناک بالکل سیدھی اور چھوٹی تھی۔ تایا جی بتایا کرتے تھے کہ وہ اپنے ڈولے پر زنجیری باندھ کر اور ڈولا پھلا کر زنجیری توڑ دیتا تھا۔ گدھے پر اپنا ہاتھ رکھ کے اور پورا زور ڈال کے گدھے کو دھرتی پر بٹھا دیتا تھا۔ زمین سے اچھل کر اور درخت کے بڑے سے ڈالے میں لٹک کر اسے اپنے ایک ہی جھکورے سے کڑاک سے توڑ دیتا تھا۔ اور نیزہ بازی میں سارے علاقے میں کوئی اس کا جوڑ نہیں تھا۔

کرتار سنگھ بلٹوہیئے کی گرجی گراں کے ویدوں کی لڑکی سے یاری تھی جس کو

سوائے اس کے جانی یار گلزار کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ ویسے اس کی ماں بھی اس بھید سے واقف ہو گئی تھی کہ اس نے ایک مرتبہ کرتار کے کپڑے دھوتے ہوئے جب ان سے خشخشے، مترقرے، شیرینہ کے ٹکڑوں اور ملٹھی کی خوشبو آئی تو اس نے پوچھا.....

"سچ بتا کرتاریاہ وہ کون ہے جس کو تو جھپیاں ڈالتا رہتا ہے؟"

اس نے بکا سا منہ بنا کر کہا مجھے گورو کی سونہہ بے بے، کوئی بھی نہیں۔ گلزار تو اینویں ای بوتیاں مارتا ہے۔ ماں نے کہا..... وے نکرمیاں مجھے اس کا نام تو بتا دے..... تو کرتار نے پھر گورو کی سونہہ کھا کر کہا، کوئی ہو تو اس کا نام بتاؤں بے بے۔ تُو تو ویسے ہی وہموں میں پڑ جاتی ہے۔"

سابو نے کہا "ویدوں کی اس لڑکی کا نام منورما تھا۔"

دینو نے پوچھا "تجھے کس نے بتایا؟" تو سابو دونوں ہاتھ منہ پر مل کے بولا "میں نے بہت سنی ہے یہ کہانی تایا جی سے۔"

"پر تجھے یہ تو پتہ نہیں ہو گا کہ کرتار سنگھ بلنوہیئے کو مارا کس نے تھا؟"

"اس کا تو کسی کو بھی علم نہیں ویر جی۔" سابو نے کہا "چھ بندے پکڑے گئے تھے۔ پانچ بری ہو گئے تھے اور ایک کو پھانسی بول گئی تھی۔ وہ بھی ہائیکورٹ سے بری ہو گیا تھا۔"

دینو نے کہا "اس برکھا بھری کالی رات میں جب بیٹر کے اندر ویریوں نے کمند پھینک کر کرتارے کو گھوڑی سے گرایا ہے تو کالی نتنی الف ہو گئی۔ اس نے اپنی دونوں اگلی ٹانگیں آسمان تک اٹھا کر ویریوں پر حملہ کیا۔ لیکن وہ بچ گئے اور کرتارے کے ہردے میں برچھی گاڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اس کالی سیاہ اندھیری رات میں کالی سیاہ مشکی گھوڑی جب بھری بارش میں ننگ دھڑنگ واپس گھر پہنچی تو کرتارے کی ماں چیخ مار کر اٹھی کہ میرے کرتارے کی نتنی برباد ہو گئی لوگو۔ اس کا کلغی والا مارا گیا۔ شاہ جوان کواری کی عزت لٹ گئی۔"

اچانک موٹر کے اگلے پہیے زور سے اٹھے اور دھب سے نیچے گرے۔ پیچھے بیٹھا بردا اپنی سیٹ سے اچھلا اور چھت سے ٹکرا کر اپنی سیٹ پر آ گرا۔ دینو نے کہا "کوئی بہت ہی ظالم سپیڈ بریکر تھا۔ میرے ہاتھ سٹیرنگ پر نہ ہوتے تو میں تو کھڑکی سے باہر نکل

گیا تھا۔"

"لیکن لانگ روٹ کی مین سڑک پر آج تک کوئی سپیڈ بریکر بنا نہیں۔ یہ کچھ اور تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے چوہدری جی۔" بردے نے تائید بھرے لہجے میں کہا۔

دینو بھی سوچ میں ڈوب گیا کہ اگر یہ سپیڈ بریکر نہیں تھا تو پھر لینڈ روور اچھلی کیوں اور لمبے روٹ پر چونکہ سپیڈ بریکر نہیں ہوتے پھر گاڑی الف کیوں ہوئی اور اتنے زور سے اچھلی کیوں!"

سابو نے کہا "جب کرتارے کی موت کے ایک سال بعد اس کی ماں نے مشکی گھوڑی بیچ دی تو گاؤں والوں نے گھوڑی کو جاتے وقت روتے دیکھا۔ وہ خریدنے والے کو اچھی طرح سے جانتی اور پہچانتی تھی کہ وہ کرتارے کا بچپن کا دوست تھا لیکن کالی نتنی نے اسے اپنے گاؤں کے اندر سوار ہونے نہ دیا۔ جب وہ بستی کی حد سے باہر ہوگئے تو گھوڑی نے اپنی تھوتھنی گورنام کے کندھے پر رگڑ کر اسے سوار ہونے کی دعوت دی اور وہ ڈرتے ڈرتے اپنے یار کی گھوڑی پر سوار ہوکر اپنے چک کی طرف روانہ ہوگیا۔"

"لاہور کتنی دور رہ گیا جی؟" کلاشنکوف والے بردے نے پیچھے سے پوچھا تو دینو نے گردن ہلائے بغیر جواب دیا "پچیس میل" —

سابو نے کہا "بڑا لمبا مقدمہ چلا۔ بے بے نے پورا رقبہ بیچ کر بیٹے کے قاتلوں کی ساری گردنیں پھندوں میں پھنسا دیں لیکن پانچ صاف بری ہوگئے اور چھٹے کو شش بول گئی۔"

"وہ بھی ہائیکورٹ میں بری ہوگیا۔" بردے نے ہنکارا بھرا تو سابو نے اپنے چچا زاد بھائی سے کہا "ویر جی پورے چھ سال تک کرتارے کی مشکی گھوڑی نتنی گورنام کے پاس رہی۔ لیکن کبھی کھلی نہیں۔ ویسی نہیں رہی جیسے اس عمر کی الڑھ بچھیریاں رہا کرتی ہیں۔ بجھ سی گئی اور سردیاں گرمیاں گھرے سلیٹی رنگ کا جھول پہن کے ہی سارا وقت گزار دیا۔ گورنام پٹی چھوڑتا بھی تھا اور ایڑھی بھی لگاتا تھا۔ لیکن وہ دُلکی سے آگے نہ بڑھی۔ پوئیے سرپٹ کے لئے اس کا دل ہی نہیں مانا۔ دھمالی چلتی یا رہوار، منزل پر پہنچا

دیتی لیکن کبھی سر اٹھا کر گردن کو کمانچہ نہیں بنایا- دل گرفتہ سی جاتی اور ویسی ہی سر نہادہ واپس آ جاتی- گورنام کو اس کے اندر کا دکھ معلوم تھا' اس لئے اس نے مشکی سے کبھی کوئی تقاضا نہیں کیا-"

"گھوڑے کو' کتے کو اور کالے تیتر کو اپنے مالک کا بہت دکھ ہوتا ہے-" دینو نے کہا لیکن سابو نے اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی- وہ اس وقت تک اپنے تائے غلام غوث کے روپ میں اترا ہوا تھا اور فتح گڑھ چوڑیاں پہنچ چکا تھا جسے اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا-

سابو نے کہا "پورے چھ سال بعد جب گورنام کالی نٹنی پر سوار چک میں داخل ہو رہا تھا اور دو سانڈنی سوار اپنے بوتے کی مہار پکڑے نیائیں کے کھنگروں پر پیدل چل رہے تھے' کالی نٹنی اتنے زور سے ہنہنائی کہ گورنام کی گرفت زین پر ڈھیلی ہو گئی- اپنا راستہ چھوڑ کر اور دونوں کنوتیاں دبا کر نٹنی چیتے کی طرح نیائیں میں جھپٹی تو گورنام اس کی پیٹھ سے اچھل کر راستے کی موٹی دھول میں گر گیا اور اس کی تہمد کھل گئی-

مشکی نٹنی دوسری جست میں پیدل چلتے سانڈنی سواروں کے سامنے پہنچ گئی- اس نے دونوں پچھلے سموں پر اپنا پہاڑ جیسا بدن تول کر بائیں طرف کمر لچکائی اور دائیں طرف گردن میں خم ڈال کر آسمان بھر اونچی اگلی ٹانگوں کے ساغری سم جوڑ کے سامنے والے شخص پر تین ٹن کا دوموہا ہتھوڑا چلا دیا- ایک' دو' تین اور جب اس نے گرے ہوئے شخص کے سر پر چوتھا وار کیا تو اس کا بھیجا دور دور تک پھیلے ہوئے کھنگروں سے جا کر چپک گیا- دوسرا آدمی اونٹ کی مہار چھوڑ کر بھاگا تو نٹنی کی مہیب آواز نے اس کے قدم پتھرا دیے- نٹنی کی پہلے ہی وار اس کی ریڑھ کو ریزہ ریزہ کر کے توڑتی رہی- اونٹ کی مہار اس کے ٹیڑھے نتھنے سے ملگجی دھار کی طرح سیدھی سطیر زمین پر اتر رہی تھی- اور وہ بڑے اطمینان سے کھڑا جگالی کر رہا تھا-"

لینڈ روور کے انجن سے چنگیز خان کے لشکر کی ایک خوف ناک صدا بلند ہوئی اور تقریباً تیس ہارس پاور کی ٹاپ نے اندر ایک کھڑدبی سی مچا دی- دینو نے چیخ کر کہا "ویر جی ٹائی راڈ ٹوٹ گیا-"

ایک دم بریک لگا کر جب تینوں نے نیچے اتر کر دیکھا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا

اور انجن اپنے نیوٹرل میں بڑی شائستگی کے ساتھ چل رہا تھا۔

جب سب واپس آ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے تو ہر ایک نے شکر ادا کیا کہ ٹائی راڈ صحیح سلامت ہے اور انجن اپنی فل پاور میں چل رہا ہے۔ لیکن سب حیران ضرور تھے کہ وہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ اور اس کا چنگھاڑ سے اور میدان جنگ کے گھوڑوں کی آواز سے کیسا تعلق تھا۔ پر یہ کوئی ایسی توجہ طلب بات نہیں تھی۔

اب لاہور قریب آ گیا تھا اور ان کے سامنے دو راستے تھے کہ وہ نہر کنارے یونیورسٹی کیمپس والے راستے سے گلبرگ جائیں یا وحدت روڈ پکڑ کر فیروز پور روڈ کے پل پر پہنچ جائیں۔ سابو نے کہا "وحدت روڈ ٹھیک ہے۔" لیکن جب وہ وحدت روڈ پر اقبال ٹاؤن کے دہانے کی سرخ بتی پر رکے تو عین ان کے سامنے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے رک کر کلاشن کوف کی ایک لہراتی ہوئی افقی باڑھ ماری۔ اسے جلدی سے دہرایا اور پھر لینڈ روور کی تیز اور چمکدار بتیوں کے سامنے تیزی سے نکل گئے۔

دینو اور سابو جنہوں نے اقبال ٹاؤن آنے پر مشکل سے علامہ اقبال کے کمال فن کی بات کر کے ان کے خواب پاکستان کا ذکر شروع ہی کیا تھا، دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئے۔ پچھلی سیٹ پر جو بردا کلاشن کوف سنبھالے بیٹھا تھا، وہ ہسپتال جا کر ختم ہو گیا اور ان کی موٹر کو اسی مقام پر سڑک کے کنارے روک کر پولیس نے تفتیش شروع کر دی۔

کچھ فیتے اور پیمانے لے کر سڑک ناپی گئی اور کچھ موٹر کا قد بت ماپا گیا۔ اس کے بعد موٹر کے اندر سے فنگر پرنٹ اور باہر سے اس کے فوٹو اتارے گئے۔ ڈی آئی جی صاحب کے حکم سے ایک سپاہی کی ڈیوٹی موٹر کے پاس لگ گئی۔ اور وہ اپنی پرانی وضع کی رائفل لے کر ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

اگلے روز صبح سویرے پولیس کے چھوٹے بڑے افسروں کے ہمراہ کوئی پندرہ بیس سپاہیوں کی نفری وہاں جمع ہو گئی۔ اخباروں میں تین کالمی سرخی سے یہ خبر شائع ہوئی تھی اور اس میں دینو سابو خاندان کے اس موروثی جھگڑے کا مذکور تھا جس میں مخالف پارٹی کے تین آدمی ابھی تک جیل میں تھے۔

لینڈ روور دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی گئی تھی اور اس کے پہیوں کے آگے ایک ایک اینٹ رکھ دی گئی تھی۔ سہالہ سے دو ایکسپرٹ آ رہے تھے اور ڈی آئی جی صاحب کے خصوصی تعلقات کی بنا پر اس واردات کی بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تفتیش ہو رہی تھی۔ موسم کی خرابی کے باوصف ایک فلی آرمڈ سپاہی ہر وقت گاڑی کے باہر ڈیوٹی پر موجود تھا۔

سارا دن گزر چکا تھا لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آ سکی تھی۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار کر طرح طرح کے مال برآمد کر رہی تھی لیکن انہوں نے ابھی تک ایک بھی مشتبہ شخص گرفتار نہیں کیا تھا۔ اخبار والے البتہ چھبیس کے قریب مشتبہ اشخاص بے نقاب کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ ہر ایک کے نام کے ساتھ مبینہ لگا ہوا تھا اس لئے کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا۔ مجرم دندناتے پھر رہے تھے۔

جب رات کے بارہ بجے اور فلی آرمڈ باوردی سپاہی قریبی کھوکھے پر جا کر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا تو دونوں مجرم اپنی دوسری نئی موٹر سائیکل پر ننگے منہ اور ننگے سر، بغیر کسی ہتھیار کے دندناتے ہوئے نکلے اور لینڈ روور سے ذرا دور صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے دندنانے لگے۔ انہوں نے دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں۔ وہ آن ڈیوٹی سپاہی جس کا ذکر انہوں نے اخباروں میں پڑھا تھا، اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ آدھی رات کا ٹریفک اپنے روزانہ معمول کے مطابق چل رہا تھا اور وحدت روڈ پر خاصی چہل پہل تھی۔

دونوں مجرم حوصلہ کر کے موٹر کے قریب آ گئے اور اس جگہ کا جائزہ لینے لگے۔ جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے ریپیڈ فائر کئے تھے اور اپنے مشن میں سو فی صد کامیاب ہو کر گھر واپس گئے تھے۔

رات کا سماں، اونچی اور مدھم سٹریٹ لائٹس، قاتلوں کے چہرے پر شیطنت، ساتھ ہی تحقیر اور خود بینی و خود رائی کے تاثرات، آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ قاتلوں کو اتنا قریب، اس قدر پرسکون اور ایسے گھمنڈی اور مغرور دیکھ کر لینڈ روور کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کی بتیاں ایک دم روشن ہو گئیں۔ پھر

اس نے فرسٹ گیئر میں ایک سو بیس میل کی سپیڈ پر اپنے آپ کو ابھارا اور ایڑیوں پر سے اچھل کر بھیڑ جوڑے کے گورے قاتل کو ٹکر ماری جو کچھ دیکھے، سوچے، بولے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تو موٹر نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اور بائیں طرف گھوم کر بھاگتے قاتل کو زور کی ایک سائیڈ ماری اور اسے زمین پر گرا دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو لینڈ روور نے اپنا اگلا اور پچھلا پہیہ اس پر سان کی طرح چلا دیا۔ ریڑھ کی ہڈی کا چورا کرنے کے بعد اس نے اوندھے لیٹے ہوئے بے ہوش قاتل کا پنجر توڑنا شروع کیا اور جب تک اس کی پسلیوں کی چھوٹی چھوٹی گنڈیریاں نہیں بن گئیں، لینڈ روور اپنے اگلے پہیوں کی آری اسی طرح چلاتی رہی۔ بہت سے لوگوں نے اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن کوئی بھی کچھ سمجھ نہ سکا۔ بھاگنے والے خوف زدہ جوڑے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے یہی کہتے جا رہے تھے کہ یہ حادثہ نہیں ہے، کوئی پرانی دشمنی ہے ورنہ اندر بیٹھا ہوا ڈرائیور اس طرح سے کچوکے دے دے کر کیوں مارے!

صبح جب ڈی آئی جی صاحب اپنے تفتیشی عملے کے ساتھ موقع واردات پر آئے تو لینڈ روور اسی طرح سے اپنی جگہ پر کھڑی تھی اور اس کے پہیوں کے آگے ایک ایک اینٹ بدستور رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے موقعے پر موجود محافظ سنتری سے پوچھا تو اس نے قرآن کی قسم کھا کر کہا کہ میں تو ایک منٹ کے لئے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا، صرف ایک پیالی چائے پینے گیا تھا اور اسی عرصے میں یہ سارا کھیل ہو گیا۔

ڈی آئی جی نے پوچھا "اور یہ موٹر چلا کون رہا تھا؟"

سپاہی نے ہکلاتے ہوئے کہا "جناب عالی! میرے ہوتے ہوئے تو کوئی بھی اس کے اندر داخل نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ تو بعد میں ہوا۔"

"اور اس کی چابیاں کہاں تھیں؟" انہوں نے کڑک کر کہا۔

"چابیاں میرے پاس تھیں جناب عالی۔ میری برانڈی کی جیب کے اندر۔"

"تو پھر کس طرح سے موٹر سٹارٹ ہو گئی؟"

"پتہ نہیں جناب عالی۔ میں خود حیران ہوں۔"

"تم کو سوائے حیران ہونے کے اور کچھ آتا بھی ہے!" ڈی آئی جی صاحب نے غصے سے پوچھا۔ "کس نے تمہاری ڈیوٹی لگائی تھی یہاں؟"

"منشی شیر دل نے جناب عالی!"

"سبھی گولی کے لائق ہو۔" ڈی آئی جی صاحب نے تیوری چڑھا کر کہا "کیا منشی اور کیا بے منشی!"

مکینک جو بونٹ کھول کے اندر انجن کا مطالعہ کر رہا تھا، گردن باہر نکال کر بولا۔ "سر جی ویسے تو کچھ خاص سمجھ نہیں آیا، لیکن ایسے لگتا ہے کہ بیٹری ارتھ ہو گئی اور اگنیشن آن ہو گئی۔ اگنیشن آن ہوئی تو گاڑی خود بخود سٹارٹ ہو گئی۔ سٹارٹ ہوئی تو گیئر میں ہونے کی وجہ سے چھڑپا مار کر آگے بڑھی اور پھر سب کو لپیٹتی چلی گئی۔"

مکینک کی یہ بات سن کر گاڑی بہت مسرور ہوئی اور اس کے کاربریٹر سے ہلکی سی آواز آئی "اوئے روئیں اپنی مکینک گری کو گدھے، کبھی موٹر اس طرح سے بھی سٹارٹ ہوئی ہے!"

ملک مروت

کچھ ایسا عجیب دن بھی نہیں تھا، کچھ اس کے دماغ پر بوجھ بھی نہیں تھا۔ ایسے خیال بھی نہیں تھے جو اکثر پکڑ لیا کرتے ہیں اور ہر بندہ ان کی لپیٹ میں کوئے کے اندر محبوس ہوتا چلا جاتا ہے۔ نہ ہی کسی نے کوئی فرمائش کی تھی کہ مجھے آج ہی گل بکاؤلی لا کر دو، نہ ہی گھر والوں نے بھیجا تھا اور نہ ہی اس کا اپنا کوئی پروگرام تھا..... بس ایسے ہی گھر سے نکل پڑا اور ایسے ہی گیراج کا پھاٹک کھول کر اندر سے گاڑی نکالی اور ایسے ہی بے دھیانی میں تین مرتبہ گاڑی کا ہارن بجا کر بل کھاتی سڑکوں سے نیچے اترنے لگا۔

جب وہ سنی بینک کے پٹرول پمپ پر پہنچا تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنا کیمرہ کھڑکی میں کھلا چھوڑ آیا ہے اور کھڑکی کا پٹ آدھا بند ہے۔ بارش نہ بھی آئی تو پھر بھی کیمرے کے بھیگ جانے کا پورا اندیشہ ہے کہ کوئی ننھا سا معصوم بادل اس کھڑکی میں داخل ہو کر جب اندر کمرے میں اترے گا تو سب سے پہلے کیمرے سے لپٹے گا۔ لیکن اب وہ واپس بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس کا دل واپس جانے پر رضامند نہیں تھا۔

دانیال نے پیچھے مڑ کر دیکھا، کانونٹ کی لڑکیوں سے بھری ایک وین اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس نے ایک طرف ہو کر وین کو راستہ دیا اور پھر سوچنے لگا کہ اگر میں یہیں سے اپنے خیال کی لیزر بیم کھڑکی پر ماروں تو کھڑکی کا پٹ فوراً بند ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے خیال کو ایک مرکز پر مجتمع کیا اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ اسے ذہن کے چنگل میں پکڑ کر اس کا ایک یارکر پھینکا۔ کھڑکی کا پٹ ویسے کا ویسا کھلا رہا اور کیمرہ اسی طرح ونڈو سل کے اوپر پڑا تیرتے بادلوں کو اپنے لینز میں اتارتا رہا۔ لیکن یہ دانیال کا ایک محتاط اندازہ تھا۔ بہت ممکن ہے اس کے "بند سم سم" یارکر سے پٹ واقعی بند ہو گیا ہو

اور اس کا کیمرہ ہر طرح کی آفت سے محفوظ ہوگیا ہو! لیکن یہ "ممکن" اس کے دائرہ فکر سے بہت باہر کی چیز تھی کہ اس نے ممکنات کو منطقی فریم ورک سے باہر رکھ کر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

اس نے پیڈل پر اپنے پاؤں کا دباؤ اس لیے ڈھیلا کر دیا کہ وہ کافی تیز جا رہا تھا اور پہاڑی علاقے میں اترائی کے وقت ایسی تیزی سے نہیں جایا کرتے۔

اب گھوڑا گلی کی وسیع و عریض پاٹ دار سڑک آ رہی تھی اور دانیال کیسٹ کے ساتھ پوری آواز میں ڈوئٹ گاتے موڑ سے بڑے دھیمے انداز میں نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ گھوڑا گلی کے دہانے پر اپنی کار روک کر نیچے والی سڑک پر اترے گا' ایک کپ چائے پیئے گا اور پھر اسی طرح گاتا بجاتا اسلام آباد پہنچ جائے گا۔ لیکن یوں نہ ہوا۔ اس کے گھوڑا گلی والے پاٹ تک پہنچتے پہنچتے اتنی دبیز دھند نیچے اتری کہ اس نے ہر نظر آنے والی شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سارے ٹریفک کی بتیاں ایک دم روشن ہوگئیں اور جو ذرا عمر رسیدہ لوگ تھے' وہ اپنی گاڑیوں کی بتیاں جلا کر اور ہینڈ بریکیں لگا کر سڑک کنارے کھڑے ہوگئے۔ دھند کے ساتھ فوراً ہی کالے بادلوں کا ایسا پرا اٹھا کہ اس نے دھند کو اپنی سیاہ چھاتی سے لپٹا لیا۔

پہاڑوں پر عام طور پر ایسے کالے بادل نہیں ہوا کرتے۔ ہوتے بھی ہیں تو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر اوپر آسمانوں کی پہنائیوں میں ہوتے ہیں' آبادیوں میں نہیں آتے۔ آبادیوں میں اترنے والے اور گھروں میں گھسنے والے بادل عام طور پر بھوسلے سے ہوتے ہیں جن کا رنگ ان عمر رسیدہ بندروں جیسا ہوتا ہے..... وہ بندر جو پہلے صرف بھوربن میں نظر آتے تھے لیکن اب باڑیاں میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔

جب ان کالے بادلوں نے ہر شے کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا تو دانیال نے چائے پینے کا ارادہ ترک کرکے اپنا سفر جاری رکھا اور اپنی ہیڈ لائٹس سے راستے کو آنکتا ہوا آگے نکلنے لگا۔ راستے میں اس نے چند ایسے جغادری ڈرائیوروں کو دیکھا جو اپنے ٹرک سڑک کنارے روک کر ان کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے۔ دانیال زیر لب ان ڈرائیوروں پر مسکرایا اور پھر آگے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ پہاڑ پر نیچے اترنے کے بجائے اوپر چڑھ

رہا ہے اور اس کی سامنے کی سڑک ایک تنگ سے راستے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ گاڑی روک کر اس نے کھڑکی کا شیشہ کھولا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھند ملے بادل یا بادل ملی دھند میں دیکھا لیکن وہ کوئی خاص اندازہ نہ لگا سکا کہ اس وقت وہ کدھر ہے۔ بس ایک ہلکا سا اشارہ ملتا تھا کہ وہ بڑی سڑک چھوڑ کر اوپر چڑھ گیا ہے اور ابھی اور اوپر چڑھ سکتا ہے۔ کھڑکی بند کر کے اس نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور مزید اوپر چڑھنے لگا۔

سامنے کی سڑک ایک پہاڑی راستہ تھی جس کی سخت زمین پر بڑی کڑبڑی گھاس اُگی ہوئی تھی اور جس کے دونوں کناروں پر چیڑ کے درمیانہ قد درخت ایستادہ تھے۔ دانیال اس اور اوپر چڑھتے ہوئے راستے سے اب قدرے خائف ہوگیا تھا اور اس نے گاڑی کی رفتار بے حد ست کر لی تھی۔ سپیڈو میٹر کے بموجب وہ مری سے کوئی بائیس کلومیٹر آگے آ گیا تھا اور اس کے اپنے اندازے کے مطابق اس نے آہستہ آہستہ ایک مرتبہ پھر پنڈی پوائنٹ جتنی اونچائی حاصل کر لی تھی۔

گاڑی اُسی ست روی سے چل رہی تھی اور دانیال اسی بحران و فشار کی حالت میں اسے آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ اچانک سامنے اسے کھلے راستے کا ایک وسیع ٹکڑا دکھائی دیا جس کے کنارے درخت بھی نہیں تھے اور جس کے فرش پر ویسی گھاس بھی نہیں تھی۔ ایک لمبی، کھلی اور ہموار سطح تھی جس پر گاڑی کی سپیڈ بلاخوف و خطر تیز کی جا سکتی تھی۔

جونہی دانیال نے پیڈل پر اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالا، دھند میں سے چیختی ہوئی ایک آواز گاڑی کے بند شیشوں سے تڑپتی ہوئی اندر اتری..... "سٹاپ! سٹاپ!!" اور اس کے ساتھ "ڈونٹ ڈو اٹ، ڈونٹ ڈو اٹ" کی آوازیں بازگشت بن کر گونجنے لگیں۔ دانیال نے گاڑی روک لی اور انتظار کرنے لگا۔

ادھیڑ عمر کا ایک پریدہ رنگ آدمی چترالی ڈریسنگ گاؤن پہنے اور سر پر نیلا کلاوہ چڑھائے بڑی تیزی کے ساتھ گہری دھند سے نمودار ہوا اور موٹر کی کھڑکی کے پاس رک کر کھڑا ہو گیا۔ دانیال نے جلدی سے شیشہ اتار کر اسے سلام کیا اور اس کے خوبصورت عمر رسیدہ چہرے کی رنگت دیکھ کر مبہوت ہوگیا۔ اس کی جلد سنہرے گلابی رنگ کی تھی، منہ اور دونوں ہونٹ شفقت کے جوس سے لبریز تھے اور آنکھیں خود

تشیمی سگنل پر چوکسی کے انداز کی تھیں۔

او عمر کے اس شفیق آدمی نے اپنا دایاں ہاتھ ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے نکال کر فضا میں لہرایا اور گھبرا کر بولا "میاں آپ نے تو حد کر دی جو اس خلا کے دہانے تک گاڑی لے آئے اور پھر اس گہری کھائی کو چٹیل میدان سمجھ کر یہاں اپنی رفتار اور بھی تیز کرنے لگے تھے۔ ذرا باہر نکل کر تو دیکھئے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں۔"

دانیال گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس کا پاؤں ایک چھوٹے سے گڑھے میں اترنے کی وجہ سے بل کھا گیا۔ اس نے گھوم کر گرنے کی شرمندگی سے بچتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی ہلکی سی تالی بجائی اور پاؤں جما کر بولا "سر! یہ کون سی جگہ ہے اور میں کہاں آ گیا ہوں؟"

خوبصورت بزرگ نے کہا "یہ بھی آپ ہی کا علاقہ ہے، آپ ہی کا وطن ہے اور آپ ہی کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے لیکن آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ آپ کا راستہ نہیں ہے۔ آپ کا زمان و مکان نہیں ہے۔"

دانیال نے کہا "سر! ذرا سی دھند چھٹ جائے اور مطلع صاف ہو جائے تو پھر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے کس طرف کو نکلنا چاہیے۔"

"جب تک آپ ہمارے یہاں رُکیں" بزرگ نے کہا "ایک کپ کافی پئیں، ذرا سا ستائیں اور پھر جب سورج گرم ہو کر دھند کو کاٹ دے تو بھلے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔"

دانیال بزرگ کا شکریہ ادا کر کے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ پگڈنڈی پر سے اتر رہے تھے تو دانیال نے دیکھا کہ اس کے گھر کو جانے والا راستہ بہت ہی خوش گوار اور بے حد موافق، مہربان اور نیاز مند سا تھا۔ جیسے جیسے وہ چلتے جا رہے تھے، راستہ انہیں راہ دیتا جا رہا تھا۔ ایک قدم اٹھانے پر پانچ پانچ قدم ادب کے مارے خود ہی نیچے سے سرک جاتے تھے۔

جلد ہی وہ اس بزرگ کے گھر پر پہنچ گئے۔

یہ پرانی وضع کی ایک مضبوط اور سنگین کوٹھی تھی جو پتھروں کو گھڑ کے بنائی گئی تھی اور جس کے دو بڑے دود کشوں سے ملگجے رنگ کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ باہر کا آہنی

گیٹ بھاری لوہے کا بنا تھا اور اس پر کوئی ایک ہفتہ پہلے کا سندھوری پینٹ جگمگا رہا تھا۔

یوں تو دھند کے سمندر میں ہر شے موٹے ٹھنڈے دھوئیں میں لپٹی ہوتی ہے اور جوں جوں آگے بڑھیں ہر لپٹی ہوئی شے کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں لیکن اس جگہ کا کچھ عجیب معاملہ تھا کہ قریب آنے پر نہ صرف ہر شے واضح ہوتی جاتی تھی بلکہ اس پر روشنی کا ایک ہالا سا بھی پھیل جاتا تھا جو سٹیج پر گاتی ہوئی بغیر تانوں کی سیاہ گاؤن پہنے پریمادونا پر پڑا کرتا ہے۔

کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے دانیال نے گیٹ کے دائیں کونے پر بزرگ کے نام کی کالی سیاہ تختی دیکھی جس پر براق حروف میں اس کا نام لکھا تھا..... ملک مروت۔ ملک تو صاف نظر آتا تھا مگر نیم پلیٹ کے عین درمیان میں ایک گھنی جنگلی بیل کے چڑھ جانے سے ملک صاحب کا نام پورا دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک آخر کی ت تھی جو اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کدھر سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بیل کیمرے کے شٹر کی طرح ایک سیکنڈ کے سویں حصے کے لیے ادھر کو ہٹی تو دانیال کو ملک مروت کا پورا نام ایک کوندے کی طرح نظر آیا اور پھر اس طرح سے چھپ گیا۔

ڈرائنگ روم کے اندر آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور کھنگلوں کا ایک بڑا سا ٹوکرا قریب ہی رکھا تھا۔ وکٹورین طرز کے صوفے اُسی زمانے کی یاد دلاتے تھے کیونکہ ان کی لکڑی ساگوان کی تھی اور اپنی ہیت سے وہ بے حد وزنی نظر آتے تھے۔ ان کی پوشش بھی اسی زمانے کی تھی۔ کمرے کے اندر کی فضا نکھی نکھی، یار باش اور جپھی مار قسم کی تھی۔ تھکے مرتے دانیال کو صوفے پر بیٹھ کر بڑا لطف آیا اور اس کی آدھی لکنت دور ہوگئی۔

صوفے کے دوسری جانب ایک اونچی سی آبنوسی میز پر پرانی وضع کے "آن لکر"، "ٹیٹ لر"، "پنچ" اور "السٹرٹیڈ ویکلی" کے رسالے پڑے تھے۔ دانیال نے حیرانی سے ان رسالوں کو دیکھا اور ابھی وہ ان تک پہنچا نہیں تھا کہ ملک مروت گرم گرم کافی کا ایک بڑا مگ اور ساتھ کوکونٹ اور جنجر کے بسکٹ لے کر آ گئے۔ دانیال اٹھ کر کھڑا ہوگیا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "بیٹھئے بیٹھئے، تشریف رکھئے۔ آج ہمارے

یہاں چھٹی کا دن ہے۔ سارے ملازم اپنے اپنے کام سے گئے ہیں۔ صرف ایک کمبل لپیٹ کر گہری نیند سو رہا ہے اور میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا —"

دانیال نے بات کاٹ کر کہا "آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ مجھے تو آپ کے گھر کے محبتی ماحول نے ہی اتنا کچھ عطا کر دیا ہے کہ اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔"

"ضرورت کیوں نہیں تھی" ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ اتنی دور ڈرائیو کر کے ہمارے علاقے میں آئے ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں، ہمارا اتنا بھی فرض نہیں کہ اس بھیگے ہوئے موسم میں آپ کو کافی کے دو گھونٹ پیش کر سکیں۔"

دانیال نے کہا "آپ کا تو چہرہ ہی ایسا خوشگوار اور پُربہار ہے کہ آدمی سب کچھ بھول کر اسی میں محو ہو جاتا ہے۔ اوپر سے آپ کا نام، داد و عطا کا منبع، شرافت کا مرکز۔ پھر آپ کا بات کرنے کا انداز —"

ملک صاحب نے کہا "اگر آپ غسل خانے جانا پسند کریں تو وہ سامنے سکرین کے پیچھے واش روم ہے۔"

دانیال نے "جی نہیں شکریہ" کہہ کر کافی کا مگ ہونٹوں سے لگایا تو وہ پہلے ہی جرعے میں ایک کے ساتھ دو سپ لے گیا۔ ایسی کافی اس نے اپنی زندگی میں پہلے نہیں پی تھی۔ وہ چینی کے بھاری مگ کو اور کافی کے نسواری مگر نوری رنگ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مگ میں اور کافی میں کچھ عجیب طرح کا تعلق تھا! اس نے اپنے تحیر کو چھپاتے ہوئے کہا "ملک صاحب آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

"اب تو مجھے اکیلا ہی سمجھئے لیکن پہلے ایسا نہیں تھا۔ گو اس وقت بھی میرے ساتھ میرے نوکر چاکر، ملازم پیش خدمت اور کارندے سبھی لوگ رہتے ہیں لیکن اپنے انداز میں، میں اکیلا ہوں۔"

"اور کب سے آپ یہاں ہیں؟" دانیال نے حیرانی سے پوچھا۔

"ایک مدت ہی ہوگئی اور اب تو مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ اس کوٹھی میں سکاچ کمپنی کا ایک کمانڈر رہتا تھا — اور ادھر اور بھی بہت سے کمانڈروں کی کوٹھیاں تھیں جو گرمیاں گزارنے یہاں آیا کرتے تھے۔ ان کی کمپنیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں جو

ساری وادی میں اپنے ٹینٹ لگا کر دور دور تک پھیل جاتی تھیں۔ صبح کے وقت جوان ڈھلانوں ہی پر ڈرل کرتے تھے، ڈھلانوں ہی پر فارمیشن بنا کر مارچ کرتے تھے — مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے۔"

"لیکن آپ کب یہاں آ کر آباد ہوئے؟" دانیال نے پوچھا "اور آپ کو کس طرح یہاں رہنے کا خیال آیا؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے" ملک مروت نے کہا "اور اس قدر طویل ہے کہ اگر میں اسے اب شروع کرتا ہوں تو نہ تو آپ اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی میں اپنا فرض سرانجام دے سکتا ہوں۔ پھر کسی وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔"

"بہت خوب!" دانیال نے قدرے بے تکلفی سے کہا "گویا اس کے بعد ہماری ملاقات پھر بھی کبھی ہو سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں!!" ملک مروت نے یقین کے ساتھ کہا "دنیا امید پر قائم ہے اور اسی قیام ہی سے دنیا کا نظام ہے۔ ہم کیوں نہیں ملیں گے بھلا — ہم ضرور ملیں گے۔"

"لیکن کیسے؟" دانیال نے پوچھا۔

"ایسے ہی جیسے ہم اب مل گئے ہیں..... اتفاق سے، مقدر سے، ایک حادثے کی وجہ سے جو رک گیا یا ایک طے شدہ وقت کی وجہ سے جو کسی اور وقت میں پہلے طے پا گیا ہے یا پھر ایسے ہی اس سنکرونائٹی کی وجہ سے جو ہم دونوں کے درمیان موجود ہے، یا کہیں سے آ موجود ہوئی ہے — بہت ساری وجہیں ہیں۔" ملک صاحب نے کہا "اتنی ساری کہ ہم انھیں شمار بھی نہیں کر سکتے۔"

دانیال بڑی دیر ان کے سامنے بیٹھا علم و حکمت کی باتیں سنتا رہا۔ پہلے تو اس نے گفتگو میں شرکت بھی کی۔ چند ایک سوال بھی پوچھے لیکن جب ملک مروت اس کے دل کی گہرائیوں تک خود ہی پہنچ گئے تو اس نے سوال کرنا بند کر دیئے اور اس چوزے کی طرح ملک صاحب کے سامنے بیٹھ گیا جسے سانپ سونگھ رہا ہو۔

بڑی دیر باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے ملک صاحب کے چہرے پر ہلکی ہلکی تھکاوٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ انھوں نے اکلوتی پرانی گھڑی کو دیوار پر دیکھا اور

چونک کر کہا "اوہ باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا۔ اب تو آپ کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ باہر دھند چھٹ گئی ہے اور راستہ بالکل صاف ہو گیا ہے۔"

دانیال نے گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو باہر سورج چمک رہا تھا اور کھڑکی میں سے اس کی روشنی پرانے شکارگاہ پر پڑ رہی تھی۔ وہ شکریہ ادا کر کے اٹھا تو ملک صاحب بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے سر کی بیلا کلاوہ اتار کر میز کے کنارے پر رکھ دی اور دانیال کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔

تیز دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں سے لے کر نیچے وادیوں تک ایک سار پھیلی ہوئی تھی اور اس نے جگہ جگہ درختوں کے گہرے جھنڈوں کو بھی اجال رکھا تھا۔ دانیال کو یہ دیکھ کر ایک زور کا چکر آیا اور وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ اس کی موٹر تیز دھوپ کے اندر پہاڑ کی ایسی چوٹی پر کھڑی تھی جس کے چاروں طرف گہری وادیاں تھیں اور اس چوٹی تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اپنی موٹر کو ایسے مقام پر دیکھ کر اس نے حیرت سے ملک صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "بس اسی لیے میں تڑپ کر اپنے گھر کے پھاٹک سے آپ کی جانب بھاگا تھا کہ آپ کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے لیکن خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ایسا نہیں کیا اور آئی بلا ٹل گئی۔"

دانیال نے کہا "لیکن سر یہ میری موٹر وہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"کمال ہے بھئی" ملک صاحب نے ہنس کر کہا "چلا کر خود لائے اور اب پوچھ مجھ سے رہے ہو۔"

"لیکن یہ وہاں سے اترے گی کیسے؟"

"اس کی فکر نہیں۔" ملک صاحب نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "جو یہاں پہنچ گئی ہے، وہ واپس بھی جا سکتی ہے۔"

پھر راستے میں دانیال نے ملک صاحب سے جتنے بھی سوال کیے، ملک صاحب نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ وہ پوچھتا رہا اور وہ چلتے رہے۔

جس پہاڑی کی چوٹی پر موٹر کھڑی تھی، اس کے ساڑھے تین طرف تو آٹھ

آٹھ ہزار فٹ گہری وادیاں تھیں البتہ چوتھی جانب جھاڑ جھنکاڑ سے پر ایک ایسی نچان تھی جو چوٹی سے تیس چالیس فٹ نیچے تھی۔

الٹی طرف رخ کیے کھڑی گاڑی کو بیک کر کے اس نچان پر اتارنا تو ایک طرف رہا کوئی شخص اسے سیدھے رخ بھی اتنی نچان پر نہیں اتار سکتا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں فولادی رسہ ڈال کر اور اس کے کنڈے کو گاڑی کے اگلے یا پچھلے بمپر میں اٹکا کر البتہ ترئی کی طرح لٹکا کر پکی سڑک پر لایا جا سکتا تھا..... لیکن ہیلی کاپٹر کا حصول ناممکن تھا!

جب وہ دونوں موٹر کے قریب پہنچے تو ملک مروت نے ہاتھ بڑھا کر موٹر کی چابیاں طلب کیں اور اپنا چترالی چغہ اتار کر دانیال کے حوالے کر دیا۔

جب ملک صاحب نے گاڑی کے اندر بیٹھ کر موٹر سٹارٹ کی تو دانیال نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

موٹر کے تھروٹل نے ایک زور کی چنگھاڑ ماری اور تینوں وادیاں ایک ساتھ گونج اٹھیں۔ پھر گاڑی تیزی کے ساتھ بیک ہوئی اور بڑی دکھی آواز میں چالیس فٹ نچان پر کسی ماؤس کی طرح بھاگتی ہوئی صاف راستے پر آ کر رک گئی۔ دانیال نے آنکھیں کھول کر دیکھا ملک صاحب سٹارٹ موٹر کے پہلو میں کھڑے ہاتھ کے اشارے سے دانیال کو اپنے پاس بلا رہے تھے۔

دانیال نے موٹر میں بیٹھنے سے پہلے دو ہاتھوں سے ملک صاحب کے ساتھ مصافحہ کیا اور گلوگیر آواز میں بولا "اگر آپ یہاں موجود نہ ہوتے تو میں نے اب تک فوت ہو جانا تھا۔"

"خدا نہ کرے!" ملک صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا "موت کا تو ایک وقت اور مقام مقرر ہے۔ نہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے آ سکتی ہے نہ اس کے بعد۔"

چلنے سے پہلے دانیال نے کندھوں تک اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال کر کہا "ملک صاحب میں آپ کا کارڈ لینا تو بھول ہی گیا اگر اس وقت جیب میں ہو تو عنایت فرما دیجئے۔"

ملک صاحب نے ولایتی لوگوں کی طرح کندھے اٹھا کر اور سر اندر دھنسا کر

دونوں خالی ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس وقت تو نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو نہیں دیتے کہ آپ نے میرا غریب خانہ تو دیکھ ہی لیا ہے۔ جب جی چاہے، آئیں اور شوق سے آئیں بلکہ ــــ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ اصل گھر!"

دانیال دونوں ہاتھ ماتھے کو لگاتا اور ملک صاحب کا شکریہ ادا کرتا شیشہ چڑھا کر اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ پکی سڑک پر اپنی کار دوڑاتے اور دو سپیکروں والے کیسٹ پلیئر پر ایمن کلیان سنتے ہوئے دانیال نے سوچا کہ اللہ کے بزرگ کیسے کیسے روپ میں کہاں کہاں پڑے ہیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ گنجلک پہاڑوں اور نوکیلی چوٹیوں کے درمیان ایک ایسا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ گھر کہہ لیجئے یا پرانی وضع کا کلونیل بنگلہ کہہ لیجئے۔ بنگلے کے اندر جنگلے والا آتش دان دیکھ لیجئے، پھر وکٹورین طرز کا فرنیچر ملاحظہ فرما لیجئے۔ فرنیچر کی چھبن کے اندر ایک گریس فل ہستی دیکھ لیجئے۔ ایسی ہستی جو نہ جوان ہے نہ بوڑھی، نہ سرخ و سپید ہے نہ سانولی، نہ ہنسوڑھے نہ سنجیدہ، نہ دبلی پتلی ہے نہ بھاری بھرکم، نہ احسان دھرتی ہے نہ کنارہ کرتی ہے بس اپنی موجودگی کا احساس دلاتی چلی جاتی ہے۔

دانیال کے دل پر اس عظیم ہستی کی محبت پھوار بن کر اتری اور پھر شراٹے دار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی روح کے ندی نالے جل تھل ہو گئے۔ خیالوں کے راستے محبت کے سیلاب میں ڈوب گئے اور وہ ملک صاحب کی اتھاہ محبت میں اتنا گہرا اتر گیا کہ اسے سامنے سے اینٹیں لانے والا ٹریکٹر اور ٹرالا نظر نہ آیا۔ پہلے وہ ٹریکٹر کے مڈگارڈ سے ٹکرایا اور پھر ٹرالے کی بڑھی ہوئی چوڑائی نے اس کی کار کو اٹھا کر اٹھارہ بیس فٹ گہرے نشیب میں پھینک دیا۔ کار چھ سات لڑھکنیاں کھاتی ہوئی ایک پرانے نالے کے چھوٹے پیندے میں اتر گئی۔

اپنے سر، ماتھے، گردن اور کندھوں پر سفید براق پٹیاں بندھوا کر اور ایتھر، سپرٹ اور مختلف ٹنکچروں میں نہا کر جب دانیال اکیلا ہی پرمٹ آپریشن روم سے باہر نکلا تو اسلام آباد کمپلکس کے برآمدوں سے پیلی دھوپ واپس جا رہی تھی۔ سامنے خوبصورت بنگلوں کے پیچھے مرگلہ کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہسپتال کے بندے دکھائی نہیں دیتے تھے البتہ مریضوں کے لواحقین برآمدے کے اندر دیواروں

سے ڈھو لگائے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ دانیال ان کی طرف کوئی خاص توجہ دیے بغیر آگے نکل گیا۔

گو بھر گرمیوں کا موسم تھا لیکن آج کا دن بہت ہی خوشگوار تھا۔ لمبے برآمدے کے آخر میں، بہت دور اس نے ملک مروت کو اپنی جانب تیزی سے آتے دیکھا تو دانیال نے بھی ان کی پذیرائی کے لیے اپنی رفتار تیز کر دی۔

ملک صاحب نے ہلکے نیلے رنگ کا ڈبل بریسٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے پیتل کے بٹن ہلکی سی روشنی پڑنے پر بھی تیز تیز لشکارے مار رہے تھے۔ ملک صاحب مسکراتے ہوئے دانیالؔ کی جانب بڑھ رہے تھے اور ان کا چہرہ موزیک پر پڑتی ہوئی دھوپ کے عکس میں شدت سے جگمگا رہا تھا — دانیال کے قریب آتے ہوئے انہوں نے اپنے دونوں بازو آگے پھیلا کر اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اپنی پٹیوں میں لپٹا ہوا دانیال جوگنگ کے انداز میں آگے کو جھک کر تیز تیز قدم مارنے لگا اور جلد ہی ملک صاحب کے کھلے ہوئے بازوؤں میں جھول گیا۔

ملک صاحب نے بڑے دلار سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اسے اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے کہا "ابھی جب آپ میرے یہاں تشریف لائے تھے تو آپ کو میری نیم پلیٹ پڑھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ میرا نام ملک مروت نہیں، ملک الموت ہے۔ ایک بھرنویں سی جنگلی بیل جو میری نیم پلیٹ کے درمیان سے اوپر گزر گئی ہے، اس نے میرے نام کے "الموت" کو چھپا لیا ہے اور تیز ہوا چلنے سے وہ جب بھی ہلتی ہے "المو" "مرو" لگتا ہے۔ لیکن یہ سب زبان کی املائی ساختیات کے روپ ہیں اور اس وقت جو ہم اپنی اپنی اہم ڈیوٹی پر مامور ہیں، ہمیں املا سے اور قواعد سے کیا لینا ہے۔ ہمیں تو اپنا فرض نبھانا ہے۔"

پھر اس نے بڑی محبت کے ساتھ دانیال کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "ہر کام کے لیے وقت اور مقام طے ہوتا ہے۔ آپ میرے غریب خانہ پر پہلے ہی تشریف لے آئے، اس کا شکریہ لیکن وہ طے شدہ وقت سے ذرا پہلے تھا۔" پھر وہ دونوں لمبے لمبے، میٹھے میٹھے اور موٹے موٹے قدم اٹھاتے ہسپتال کے خاموش برآمدے سے باہر نکل گئے۔

سونی

جب ملک التجار شمس الدین کے بیٹے بختیار کی شادی ملک التجار حسن دین کی بیٹی نجمہ سے ہو گئی تو دونوں گھرانوں نے اس لگن کو اپنی خوش قسمتی جانا اور دولہا و دلہن کو اتنا مال دیا کہ ان کے آنے والے سات سال کی ضرورتیں ایک ہی دن میں پوری ہو گئیں۔

نجمہ اور بختیار امیر ترین گھرانوں میں پیدا ہونے کی وجہ سے بہت ہی شریف بچے تھے اور انہوں نے اپنی زندگیوں میں کبھی کوئی گندی بات نہیں کی تھی۔ نجمہ نے ایم اے سائیکالوجی کیا تھا اور وہ یونیورسٹی میں اول آئی تھی۔ بختیار نے ایم بی اے کیا تھا اور اس کو فرسٹ کلاس فرسٹ کی ڈگری مل چکی تھی۔ دونوں نے اپنی زندگی میں چونکہ سوائے اپنے کام کے اور سوائے اپنے نام کے اور کسی چیز سے محبت نہیں کی تھی اس لئے وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے اور انہیں پہلی دفعہ پتہ چلا کہ دام کے مقابلے میں چام سے بھی اتنی ہی محبت کی جا سکتی ہے اور اس میں بھی بڑا مزہ آتا ہے — دونوں کے والدین اس بات پر نازاں تھے کہ ان کے بچے اگر ہم خیال نہیں تو ہم حال ضرور ہیں اور شادی اور دوستی میں ہم خیال ہونا اتنا ضروری نہیں جس قدر ہم حال ہونا ضروری ہے۔

نجمہ اور بختیار کے پاس اپنی کاریں تھیں لیکن دونوں کے میک مختلف، رنگ مختلف، گیئر مختلف اور دونوں کی "کنٹریز آف اورجن" الگ الگ تھیں۔ ایک فرنٹ وہیل ڈرائیو تھی، دوسری پچھلے پہیوں کے زور پر تھی۔ دونوں کے پاس اپنا اپنا میوزک سسٹم تھا۔ ایک کے پاس جاپان کا ڈولبی سسٹم تھا، دوسرے کے پاس سویڈش اوپن ریل

ٹیپ ریکارڈر تھا۔ ایک کو دو سپیکر لگے تھے، دوسرے کو چار — دونوں کے پاس بے شمار سوٹ تھے لیکن ایک کے زنانہ تھے اور دوسرے کے مردانہ۔ ایک کو شوخ رنگ پسند تھے، دوسرے کو صوفیانہ۔ ایک کو مسک بیس والا پرفیوم پسند تھا، دوسرے کو روز کا بھکا بھک۔ لیکن استعمال دونوں ہی فرنچ پرفیوم کرتے تھے۔ دونوں کے والدین خوش تھے کہ اللہ کا شکر ہے یہ ہم حال ہیں، اگر صرف ہم خیال ہوتے تو کافی مشکل پڑ جاتی تھی۔ انہیں مزید ہم حال رکھنے کے لیے دونوں کے والدین وقتاً فوقتاً ان کو اور چیزیں بھجواتے رہتے اور ان کی ضرورتوں کا ان سے بڑھ کر خیال رکھتے۔

جب وہ دونوں ولایت سے ہنی مون منا کر لوٹے تو ان کو کسٹم پر بہت دیر رکنا پڑا کیونکہ وہ اب اور بھی ہم حال ہو کر لوٹے تھے اور ان کا بیگج بے شمار نگوں پر پھیل کر مختلف کاؤنٹروں پر پڑا تھا۔

آج کل کے امیر اور صاحب حیثیت لوگوں کے بچوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کو ہر حال میں لائق ہونا پڑتا ہے اور اپنے والدین سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔

پہلے زمانے میں امیروں کے بچے لاڈلے، نالائق اور عیاش ہو جاتے تھے اور غریبوں کے محنتی، جفاکش اور مستعد بچے ان سے آگے نکل جاتے تھے۔ اب یہ بات نہیں رہی۔ اس وقت یونیورسٹیوں، کالجوں، اداروں، درس گاہوں میں اول آنے والے سب امیروں کی اولاد ہوتے ہیں۔ صاحب حیثیت لوگوں کے بچے ہر وقت غریبی اور افلاس کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ یہ خوف ایک چھوت کی بیماری بن کر ان کی روحوں میں سرایت کر گیا ہے اور وہ ہر طرح کی لذت اور ذائقے سے محروم ہو گئے ہیں۔

خجستہ اور بختیار کے درمیان بھی جس لذت اور ذائقے نے جنم لیا تھا، وہ ہنی مون سے واپسی پر آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگا اور دونوں اپنی اپنی ذات کو الگ الگ ہینگر پر ڈال کر اسے برش کرتے ہوئے اپنی شخصیت نکھارنے لگے۔ گنوار لوگوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ دارے اور گوماں کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی لذت میں عمر بھر کے لیے گم ہو کر ترقی کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کو جو وقت بھی ملتا ہے، وہ

بجائے آگے بڑھنے کے اسے ایک دوسرے پر صرف کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں گنوار لوگ سب سے پیچھے ہیں اور ان اندوختوں سے محروم ہیں جو آج کا مہذب انسان دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے اور جس نے اس دنیا کو ارضی جنت بنا رکھا ہے۔

تو جناب بختیار اور نجمہ کے درمیان محبت اور لذت تو ختم ہو گئی لیکن ان کے درمیان انڈر سٹینڈنگ بہت بڑھ گئی۔ وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے اور آپس میں بہت ہی محبت بھرے انداز میں گفتگو کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان کی ہم حالی میں ہم خیالی بھی پیدا ہونے لگی۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے مذاق کو سمجھنے لگے بلکہ ایک دوسرے کو داد بھی دینے لگے۔ ان کی زندگی یو این جیسی خلیق، ملنسار، مہذب اور شائستہ ہو گئی اور وہ انڈرسٹینڈنگ کی چاشنی میں اس طرح سے رچ گئے کہ اٹھتے بیٹھتے ان کے منہ سے بار بار تھینک یو، ڈیئر، ہنی، سویٹ، کیوٹ نکلنے لگا۔

بختیار کے پاس پانچ کیمرے، دو وی سی آر، آٹھ ٹیپ ریکارڈر، دو ٹائپ مشینیں، ایک ہوم کمپیوٹر، تیس جگ ساپزل، ایک سولہ ایم ایم دو آٹھ ایم ایم پروجیکٹر، اکیس مربع فٹ لمبے ٹریک پر چلنے والی تیئس بوگیوں والی ایک ریل گاڑی، دو انجن: ایک ڈیزل ڈیزائن دوسرا کوئلہ شکلی، ان کے ساتھ دو ریلوے سٹیشنوں کی عمارتیں: ایک جنکشن کی دوسری فلیگ سٹیشن کی، پانچ کانٹے، تین سگنل، نو کانٹا بدلیاں، ایک گہری سرنگ، سات لیول کراسنگ تھے۔

دو بیس وولٹ کے ریگولیٹر سے فیڈ ہو کر جب یہ ٹرین بڑے سٹیشن سے چلتی تو کلکتہ سے بردوان آنے والے دیوداس کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ٹرین کی یہ چلت تین فٹ اونچے مہاگنی کے ٹیبل پر بندھی تھی اور یہ ٹیبل نوے بائی ستر فٹ کے اس Basement میں رکھا تھا جہاں بختیار کی دوسری ساری وابستگیاں پڑی تھیں۔ بختیار کا یہ Den اس کی ساری زندگی تھی..... موجودہ بھی اور مابعد کی بھی، Here بھی Hereafter بھی۔ یہیں ایک کونے میں اس کا Ham ٹرانسمیٹر نصب تھا جہاں بیٹھ کر وہ دنیا کے دوسرے ہابی اسٹ براڈکاسٹروں سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی Stray سگنل رات کے نو بجے اس کی فریکوئنسی کے چنگل سے نکل جاتا تو وہ صبح تین

چار بجے تک اس کا پیچھا کرتا رہتا۔ یہیں ایک سٹینڈ پر اس کے ایئر ماڈل رکھے تھے جن میں سے ایک گیارہ میل کی مسافت طے کر کے سانگلہ ہل کی چوٹی پر لینڈ کر گیا تھا جسے اس نے پورے نو دن سگنل دے دے کر بڑی مشکل سے ٹریس کیا تھا اور خود جا کر اسے پہاڑ کی چوٹی سے اٹھا کر لایا تھا۔ اسی ڈین میں اس کا چھوٹا سا کوکنگ رینج تھا جس پر وہ آدھی رات کے بعد کافی اور چیز اینڈ مشروم کے سینڈوچ تیار کر کے کھایا کرتا تھا۔

ہر روز صبح ناشتے کی میز پر بختیار اور نجتہ کی ملاقات ہوتی اور دونوں ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو اپنے اپنے اخبار کی خبریں سنایا کرتے۔ حالات حاضرہ پر دونوں کی نظر بڑی گہری تھی اور تھرڈ ورلڈ کے مسائل کو وہ ڈیویلپڈ کنٹریز سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ نجتہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں سوشلسٹ تھی اور اب بھی اس کی سوچ وہی تھی۔ بختیار شروع سے Fundamentalist تھا۔ دونوں کے نظریات الگ الگ تھے لیکن دونوں میں بلا کی انڈرسٹینڈنگ تھی۔ آزاد خیالی کی وجہ سے دونوں میں نظریاتی جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہت ہی خوش تھے کیونکہ دونوں اپنی اپنی راہ پر سیدھے چل رہے تھے..... پھر اچانک یوں ہوا کہ بختیار کو بزنس ٹرپ پر فار ایسٹ جانا پڑ گیا۔ دورہ تو ایک مہینے کا تھا لیکن ایک ان ہونی مجبوری کے باعث لمبا ہو گیا۔

جس دن بختیار سفر پر جانے لگا' اس روز اس کے اور نجتہ کے درمیان تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا۔ نجتہ نے کہا "بختیار! تم اپنا ایک وی سی آر مجھے دیتے جاؤ تاکہ اگر خدانخواستہ میرا خراب ہو جائے تو میں اور میری فرینڈز فلمیں دیکھنے سے محروم نہ رہ جائیں۔" بختیار نے کہا "تم اپنے لیے ایک اور خرید لو لیکن میرا گیجٹ مجھ سے نہ مانگو۔ میں ان سے وابستہ ہو جاتا ہوں تو ان کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ ان میں میری جان ہے۔"

بختیار کا یہ جواب سن کر نجتہ سکتے میں آ گئی اور چپ رہ گئی۔ اس کو ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ بختیار اس کے علاوہ کسی اور کو اپنی جان کہے گا — دونوں تھوڑی دیر ایک دوسرے کے آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بختیار اٹھا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا نیچے تہہ خانے میں اتر گیا۔ اس نے فلپس کا وی سی آر اٹھایا اور اس کو سینے سے لگا کر اوپر آ گیا۔ نجتہ ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ وی سی آر لا کر اس نے

المومینیم کی چھوٹی تپائی پر رکھا تو نجمتہ نے کہا "مجھے یہ نہیں چاہیے۔ مجھے دوسرا چاہیے' سونی!"

"سونی" کا نام سنتے ہی بختیار کا دل بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں کے پیچھے بہت سارے آنسو امڈ آئے لیکن اس نے یہ معاملہ نجمتہ پر نہیں کھلنے دیا اور جوکر کی طرح مسکرانے لگا۔

نجمتہ نے کہا "جناب کی بڑی مہربانی' شکریہ۔ یہ لے جایئے اور اس کی جگہ سونی لے آیئے۔" بختیار نے سر جھکا کر کہا "وہ تو میں کسی صورت میں بھی نہیں لا سکتا۔ اس کو تو میں نے ابھی تک چیک بھی نہیں کیا۔ صرف ڈبے سے نکال کر شیلف پر رکھا ہے۔"

"تو کیا ہوا!" نجمتہ نے ڈھٹائی سے کہا "استعمال کی چیز ہے' استعمال کے لیے بنی ہے اور استعمال کے لیے ہی خریدی گئی ہے۔"

سونی وی سی آر کے لیے استعمال کا لفظ سن کر اور اس دیدہ دلیری پر دلگیر ہو کر ملک التجار بختیار کی روح بلبلا اٹھی۔ اس نے دردناک لہجے میں کہا "سونی واقعی میری جان ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کسی کو نہیں دے سکتا۔ میرے بعد خود اٹھا کر لے جانا' بڑے شوق سے۔"

نجمتہ نے بختیار کا چہرہ دیکھا تو اس کو فکر پڑ گئی۔ اس کی رنگت فرقت زدہ انسان کے چہرے جیسی ہوگئی تھی اور اس کی آنکھیں ایک دم سے بے نور سی ہوگئی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا "اگر مجھے ضرورت پڑی تو نکالوں گی ورنہ اسی پر' اپنے والے پر دیکھتی رہوں گی — کوئی ضروری تو نہیں بختیار کہ میرے والا خراب ہو جائے۔"

"بالکل! کوئی ضروری نہیں' لازمی نہیں کہ تمہارے والا خراب ہو جائے — ہو گا بھی نہیں — لیکن اگر ضرورت پڑے تو نکال بھی لینا۔ لیکن انشاء اللہ ضرورت نہیں پڑے گی — تمہارے والا ٹھیک ہے بالکل۔"

اچانک نجمتہ کے ذہن میں ایک مہینہ پہلے والی شام اتر گئی جب وہ بختیار کو ساری کوٹھی میں تلاش کرتے کرتے گیراج کے سامنے پہنچی تھی تو اس کو بختیار کی پسندیدہ پرفیوم کی ایک لکیر سی سنگھائی دی تھی۔ اس نے شکاری کتیا کی طرح رک کر دو

سیدھے اور ایک اتنا چکر کاٹا تھا اور پھر حیرانی سے گیراج کا دروازہ دیکھا تھا جو آج زندگی میں پہلی مرتبہ اندر سے بند تھا۔ نجمہ نے چنے برابر نکلی گانٹھ سے آنکھ لگا کر دیکھا تو اندر سرخ بدن والی فراری سپورٹ کھڑی تھی اور اس کی ہڈ اتری ہوئی تھی۔ دونوں سیٹوں پر جھالر والا سفید کپڑا چڑھا تھا جس کی ڈوری سیٹوں کی پشت پر پلاسٹک کے نازک سے بکل میں بندھی تھی۔ سامنے دونوں پہیوں کے درمیان مڈگارڈوں کی ڈھلانوں پر ہاتھ رکھے بختیار زمین پر بیٹھا تھا اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نجمہ نے بہت کوشش کی لیکن اسے ٹھیک سے نظر نہ آیا کہ بختیار کر کیا رہا ہے۔ ایک دو تین اندازے لگانے کے بعد جب اس کے ذہن میں یہ تصویر ابھری کہ بختیار نے خودکشی کر لی ہے اور وہ مر چکا ہے تو اس نے زور کی چیخ ماری اور دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے لگی۔ بختیار گھبرا کر اٹھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور دروازہ کھلتے ہی نجمہ دیوانوں کی طرح اس کے ساتھ لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ اسی دن سے پتہ نہیں کیوں نجمہ کو لال فراری بری لگنے لگی اور اس کے برا ماننے پر بختیار نے چوری چھپے فراری سے ملنا شروع کر دیا۔

بختیار کو فارایسٹ کے دورے سے ایک مہینے بعد ہی لوٹ آنا تھا۔ لیکن جس جہاز سے وہ گیا تھا اسی جہاز میں چرس سمگل کرنے والا ایک نوجوان بھی تھا۔ اس کی اور نوجوان کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں، پھر جب دونوں جہاز سے اتر کر لاؤنج کی طرف جا رہے تھے تو دونوں بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کرتے جا رہے تھے۔ نوجوان نے راستے میں اپنا تھیلا بختیار کو دے کر پتلون کی پیٹی بھی کسی تھی۔ جب اس تھیلے والے نوجوان کے اوور کوٹ کے شولڈر پیڈز کاٹے جا رہے تھے تو اس کا پاسپورٹ اور ہیلتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ بختیار کے ہاتھ میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بختیار کو ہانگ کانگ میں روک کر شامل تفتیش کر لیا گیا تھا اور اس کے تین مہینے اس بک بک میں ضائع ہو گئے تھے۔ دو مرتبہ اس کے والد ملک افتخار شمس الدین اس سے ملنے ہانگ کانگ آئے اور دونوں مرتبہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ناکام واپس آ گئے۔ بختیار کی ضمانت ہانگ کانگ کے سب سے بڑے تاجر نے دی تھی اور وہی اس مقدمے کی پیروی بھی کر رہا تھا۔

چار مہینے بائیس دن اور سات گھنٹے بعد جب بختیار واپس وطن پہنچا تو کسی کو اس کی آمد کی اطلاع نہ تھی۔ فروری کے آخری ہفتے کی شام تھی، شام کے چھ بج کر

بیس منٹ ہوئے تھے اور نجمتہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اپنے سامنے اچانک بختیار کو دیکھ کر اس کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ ایک ہی جست میں وہ اس زور سے بختیار کے گلے سے جا کر لپٹی کہ اس کا کیمرہ کندھے سے لڑھک کر اس کی کلائی میں آ گیا۔ وہ تو اگر اس نے موٹی رولیکس نہ باندھی ہوتی اور وقت پر ہاتھ اوپر نہ اٹھا لیا ہوتا تو کیمرہ اپنے سارے الیکٹرونک سسٹم کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔

نجمتہ نے بختیار کو کھینچ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر باندری کی طرح اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ پھر وہ اپنے قصے کہتا رہا اور وہ اپنے دکھڑے روتی رہی۔ جدائی کے غم، فرقت کی کہانیاں، اکیلے پن کا احساس اور جب بختیار نے گردن گھما کر دیکھا تو صوفے کے پہلو میں چھوٹی تپائی پر اس کا سونی پڑا تھا اور اس کی تار زمین پر گری ہوئی تھی۔ سونی وی سی آر کا خوبصورت پلگ مٹی اور گرد سے ملیالا ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ایک موٹا سا تنکا چمٹا ہوا تھا۔ نجمتہ نے بختیار کے مڑے ہوئے چہرے کی ٹھوڑی اپنے مخروطی ہاتھ سے اپنی طرف پھیر کر کہا "وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میرا وی سی آر تمہارے جانے کے ایک مہینہ بعد خراب ہو گیا اور مجھے مجبوراً تمہارا سونی نکالنا پڑا — دیکھو میں نے اسے کس محبت سے اور احترام کے ساتھ رکھا ہے۔ ہر وقت اس پر آئرش لنن کا سرویٹ رہتا ہے۔" بختیار نے جب پھر وی سی آر کو گردن گھما کر دیکھا تو نجمتہ نے تڑپ کر کہا "آئی ایم سوری بختیار، یہ دیکھو ابھی گرا ہے — ابھی ایک منٹ پہلے اس پر تھا — میں جب اچھلی ہوں تو میرے جھل سے اڑ کر قالین پر جا گرا — میں تو اسے تمہارا محبوب سمجھ کر اس سے اور بھی پیار کرتی رہی ہوں۔ آنسٹلی!"

بختیار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور پوچھنے لگا "یہ کوئی نئی سیریز ہے؟" نجمتہ نے اپنا پاؤں کھجاتے ہوئے کہا "وہی ہے جو تم چھوڑ کر گئے تھے۔"

پھر پتہ نہیں اس کو کیا ہوا..... وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی، ٹی وی بند کیا اور سائیڈ بورڈ سے چابیاں اٹھاتے ہوئے بولی "میں ابھی سب کو جا کر بتاتی ہوں کہ تم آ گئے ہو اور ابھی سب کو اکٹھا کر کے لاتی ہوں، گیٹ ٹوگیدر کے لیے۔"

بختیار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور نجمتہ تیزی کے ساتھ دروازے

سے باہر نکل گئی۔ اس کی موٹر سٹارٹ ہونے کی آواز آئی، پھر اس کے پہیوں کی سکریچ سنائی دی اور وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

بختیار نے اپنا سر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔ بائیں پیر سے دائیں کا موکیشن اتارا اور دائیں سے بائیں کا۔ پھر دونوں پیر اوپر کر کے بیٹھ گیا۔ وہ اتنی لمبی فلائٹ کے بعد بالکل تھک چکا تھا اور اپنے سونی کو اس طرح بے آبرو دیکھ کر نڈھال ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں ہتھیلیوں سے دبائیں اور اندھیرا کر کے بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کے کان میں ایک مدھم سی آواز رس گھولنے لگی "بختیار — بختیار — سویٹ ہارٹ بختیار — !"

اس نے ہاتھ ہٹا کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے نظر کی، چھت کو دیکھا، سر کھجایا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میٹھی سی آواز آئی۔

"ادھر دیکھ جان من — میری طرف — اپنے سونی کی طرف —"

بختیار نے پلٹ کر دیکھا تو وی سی آر کی سبز بتی بارہ تیس! بارہ تیس!! بارہ تیس!!! کر کے جلنے لگی تھی اور اس کا پلگ ابھی تک اسی طرح قالین پر پڑا تھا۔

بختیار کو اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تو سونی نے ہنس کر کہا "محبتوں میں کنکشنوں کی ضرورت نہیں ہوتی بختیار! نہ تار کی نہ پلگ کی، نہ میل کی نہ فی میل کی — اس کے لیے تو بس محبوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف اسی کے دم قدم سے ساری روشنیاں ہوتی ہیں، کنیکشن سے نہیں۔"

بختیار اس بیان اور اس ماجرے کے درمیان لٹک کر رہ گیا۔

سونی نے کہا "شرم آتی ہے اور کہے بنا رہا بھی نہیں جاتا کہ نجمہ نے تیرے بعد اچھا نہیں کیا۔ وفا کے نام کو بٹہ لگایا اور تجھے بھول بھال کے تیرے ہی گھر میں اک اور گل کھلایا۔"

بختیار کو وی سی آر کی اس بات پر سخت غصہ آیا۔ چاہتا تھا کہ دھکا مار کر اس کو مع تپائی کے زمین پر گرا دے کہ ٹی وی کی سکرین روشن ہو گئی اور سامنے اس کے گھر کا منظر چلنے لگا۔

لان پر بہت سے لوگ جمع ہیں، ہائی ٹی کا سامان بہم ہے اور مہمان خوش گپیوں

میں مصروف ہیں۔ نجمہ کے ساتھ اس کی دونوں سہیلیاں ندیمہ اور رضا بھی میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ کل گیارہ اشخاص ہیں۔ سب اپنی اپنی ڈینگی بگھار رہے ہیں..... کوئی زبان سے، کوئی آنکھوں سے، کوئی زلفوں سے، کوئی اپنے انداز نشست سے، کوئی کسی کو دیکھنے اور دیکھتے رہنے سے۔ ہر شخص اپنے آپ پر سپاٹ لائٹ فٹ کروا رہا ہے۔ مسعود نجمہ کو دیکھ کر غٹرغوں، غٹرغوں کر رہا ہے اور جدھر وہ جاتی ہے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے — اچانک سکرین پر وقفہ ابھرتا ہے — بختیار چیخ کر پوچھتا ہے — "وقفہ کیوں سونی؟ — وقفہ کیوں؟" اور سونی بڑے سادھارن طریق پر کہتا ہے "آہستہ بختیار آہستہ — آرام سے میری جان — دھیرج سے — میرے پاس ٹیپ کم تھا اس لیے میں غیر ضروری سین حذف کرتا گیا۔"

پھر سین ابھرا کہ سب لوگ چلے گئے ہیں اور مسعود اور نجمہ رہ گئے ہیں۔ مسعود نے نجمہ کا پاؤں اپنی گود میں رکھا ہوا ہے اور اس کو سینڈل پہنا رہا ہے۔ پھر دونوں اٹھتے ہیں اور کچن میں چلے جاتے ہیں — سونی نے کہا "میں نے یہ سین بڑی مشکل سے بنایا ہے جانی۔ لانگ شاٹ ویسے بھی ایک مشکل کام ہے لیکن جب روشنی کم ہو اور دروازہ آدھا کھلا ہو تو کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہاری خاطر تو ہماری جان بھی حاضر ہے اس لیے میں نے لڑکھڑا لڑکھڑا کے اور گھوم گھوم کے یہ شاٹ بنایا ہے۔"

نجمہ کھانے کی میز پر بیٹھی ہے۔ مسعود بٹلر کا ایپرن باندھے اور سر پر بڑی سی ٹوپی لگائے اس کے لیے آملیٹ بنا رہا ہے اور ٹوسٹ سینک رہا ہے۔ دونوں چیزیں لا کر نجمہ کے سامنے رکھتا ہے اور خود ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر سلائس کھانے لگتا ہے۔ نجمہ اپنا آدھا آملیٹ کاٹ کر مسعود کو دیتی ہے۔ مسعود شوق اور محبت کے ساتھ کھاتا ہے۔ پھر نجمہ کا آدھا پیا ہوا گلاس اٹھا کر منہ کو لگا لیتا ہے۔

بختیار کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تو سونی نے رک کر کہا "اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہو تو بند کر دوں۔"

"نہیں نہیں، چلاؤ چلاؤ۔" بختیار نے رعب سے کہا۔ "میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے اور کون کون لوگ ادھر آتے رہے

ہیں۔"

سونی نے کہا "چھوڑو، دفع کرو۔ جب تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو میرا سرکٹ جلنے لگتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے سارے فیوز ایک ساتھ اُڑ گئے ہوں۔"

پھر بختیار نے دیکھا کہ مسعود اور نجمہ کیرم کھیل رہے ہیں اور دونوں میں سے جو کوئی بھی گوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنا سر بورڈ پر آگے کو لے آتا ہے۔ دوسرا اپنا ماتھا آگے لا کر اس جھکے ہوئے سر پر ٹکا دیتا ہے اور تین تین چار چار منٹ کے بعد ایک گوٹ چلتی ہے۔

ایک سین میں مسعود اور نجمہ لمبے صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے بازو دوسرے کی گردن کے پیچھے سے گزار کر ایک دوسرے کے کندھے پر رکھے ہوئے ہیں۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ وہ ایک نہایت ہی بور ڈرامہ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دے رہے ہیں۔

جب اگلا سین آیا تو بختیار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نجمہ مسعود کا سر اپنی فرنچ شفون کی قمیض کے کندھے سے لگائے اس میں "جین سنگ" آئل جھس رہی ہے اور ہولے ہولے کچھ گن گنا رہی ہے — بختیار نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ نہ سکا۔ کوئی فوک گیت لگتا تھا جس میں محبت کے عہد و پیمان ہوا کرتے ہیں — بختیار کی آنکھوں سے ٹپا ٹپ آنسو گرنے لگے تو سونی نے کہا "صبر! اے تاجر بچے! انسانوں کے یہی کام ہیں، یہ آج سے نہیں ازل سے یہی کچھ کرتے آئے ہیں۔ محبت کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ پہلے ان سے جانے میں یا انجانے میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے، پھر ساری عمر احساس جرم میں گزر جاتی ہے۔ ہمیں دیکھو اور ہم سے پوچھو کہ تمہاری یاد میں ہم نے کس طرح سے یہ گھڑیاں کاٹی ہیں۔ سارے تہہ خانے میں کسی نے بھی خوشی کا ایک ثانیہ نہیں دیکھا۔ سب تمہی کو یاد کرتے رہے ہیں۔"

"میں بھی تمہیں یاد کرتا رہا ہوں سونی" بختیار نے بلبلا کر کہا اور اٹھا کر سونی کو اپنی گود میں ڈال لیا۔ اس کی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی اور وہ سونی کے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سونی کے اندر سے خرخرڑ کی ایسی آواز آنے لگی

جیسے ہاتھ پھروانے والی بلی سے آیا کرتی ہے۔ بختیار نے سونی کو گود سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا تو اس کے اندر سے ایسی خوشبو آنے لگی جیسے شروع گرمیوں میں جسموں سے آیا کرتی ہے۔

سونی نے بڑی مدھم سرگرمی میں کہا "چلو نیچے تہہ خانے میں چلیں۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ذرا ٹھہرو!" بختیار نے کہا "نجمہ کو واپس آ جانے دو۔"

"دفع کرو نجمہ کو۔" سونی نے چڑ کر کہا "لعنت بھیجو اس چھنال پر' آوارہ کتیا پر — چلو!"

بختیار سونی کو اسی طرح سینے سے چمٹائے تہہ خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

چھٹے چھکا بتیس

اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ وہ کس کا عہد حکومت تھا لیکن کسی بادشاہ کا دور تھا۔ پتہ نہیں وہ آمریت کا بادشاہ تھا یا جمہوریت کا بادشاہ تھا یا بادشاہیت ہی کا بادشاہ تھا لیکن تھا بہت منہ زور اور مطلق العنان حاکم۔ مگر اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتا تھا اور رعایا کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ عوام جس طرح چاہیں رہیں، جیسی چاہیں زندگی گزاریں، جن حالوں سے گزریں وہ اُن میں دخل نہیں دیتا تھا۔ بس عوام سے پرے رہ کر ہر حال میں خوش تھا!

اس بادشاہ کے دور میں ہمارے یہاں اکنامکس کے ایک پروفیسر تھے۔ یہ تھے تو ایک مضافاتی کالج کے استاد لیکن اُن کی دانش کا شہرہ دور دور تک پہنچا ہوا تھا۔ اقتصادیات کا مشکل سے مشکل مسئلہ چنے کی کھیل کی طرح چھیل کر ہتھیلی پر رکھ دیتے تھے اور شک و شبہ کا چھلکا پھونک مار کر اُڑا دیتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ خود اُن سے اقتصادیات کے تکلیف دہ اور ٹیڑھے سوال پوچھے تھے اور پر سکون دل اور مفرح دماغ لے کر واپس گھر آیا تھا۔

میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ جب لوگوں کے پاس پیسہ بہت ہو جاتا ہے اور وہ بے حد امیر ہو جاتے ہیں اور اُن کے شہروں، علاقوں اور ملکوں میں دولت کی افراط ہو جاتی ہے تو وہ غریب کیوں ہو جاتے ہیں اور اس علاقے کو افراطِ زر کا مارا ہوا علاقہ کیوں مشتہر کیا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں کے شہریوں کو اس "افراطِ زر زدہ" علاقے سے دور رہنے کی ہدایت کیوں کی جاتی ہے؟

پھر میں نے اُن سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا دُنیا کے مانے ہوئے سو ماہرین

اقتصادیات دُنیا کو مہنگائی سے بچا سکتے ہیں؟

کیا قرض لینا ایک چھوت کی بیماری ہے جو عام شہریوں کو اپنی حکومت سے لگ جاتی ہے؟ اور کیا معیار زندگی بلند ہونے سے انسان میں درندگی کی صفات پھر سے پیدا ہو جاتی ہیں؟ اور وہ لوٹ کر پھر پتھر اور دھات کے زمانے کی طرف مراجعت کر جاتا ہے؟

پروفیسر صاحب نے مجھے سامنے بٹھا کر ایک طویل مگر دلچسپ اور خیال انگیز لیکچر دیا اور میرے کچے ذہن کی دھونسی ہوئی چھت سے بہت سے جالے دور کر دیئے!

پروفیسر ساعتی بہت ہی خوش گوار، رحم دل، سادہ مزاج اور ذہین اُستاد تھے جن کا اپنے ساتھی اُستادوں اور ہمعصر لکچرروں سے ایک الگ تعلق تھا اور وہ ہر مسئلے پر بڑی گہرائی کے ساتھ غور کرنے کے عادی تھے۔ اس غور و فکر نے اُن کی فردیت میں ایک عجیب طرح کی شان استغنا پیدا کر دی تھی اور وہ مشکل حالات سے سکاؤٹوں کی طرح سیٹی بجاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔

پروفیسر ساعتی کے مائکرو اقتصادیات پر لکھے ہوئے تحقیقی مقالے زیادہ تر غیر ملکی پرچوں میں چھپتے تھے اور اُن انگریزی مضامین کا یورپ کی دوسری زبانوں میں ساتھ ہی ترجمہ ہو جاتا تھا۔ ہر سال کم از کم ایک مرتبہ اُن کو ملک سے باہر ضرور جانا پڑتا۔ کبھی کسی سیمینار میں شرکت کے لئے، کبھی اپنے ایکسٹینشن لیکچروں کے سلسلے میں اور کبھی کسی ملک کی حکومتی دعوت پر جو اپنے مالی شعبہ اور اقتصادی سیٹ اپ میں تبدیلی کی خواہاں ہوتی تھی — اسی طرح اپنے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں جب کہیں اور جہاں کہیں کسی اقتصادی ورکشاپ کا قیام ہوتا، اس کے افتتاح کے لئے پروفیسر صاحب کو ضرور زحمت دی جاتی۔

پروفیسر ساعتی میں یوں تو ایک سکالر کی ساری خوبیاں موجود تھیں اور وہ اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی حاوی تھے اور اپنے ساتھیوں کی بڑے کھلے دل سے راہنمائی کرتے تھے اور اُن کے ساتھی اُن کو نوبیل لارئیٹ کا درجہ دیتے تھے لیکن اس سارے تبحر علمی اور دانش برہانی کے باوجود اُن میں ایک ایسی چھوٹی سی کمی تھی جس نے اُن کے سارے ہمعصر اُستادوں، تمام ملنے والوں اور گھر کے ہر شخص کو

اُلجھن میں مبتلا کر رکھا تھا بلکہ اگر اُلجھن کے بجائے اُنہیں شرمندگی میں مبتلا کر رکھا تھا کہیں گے تو زیادہ مناسب ہو گا۔

پروفیسر صاحب چھ ضرب چھ کو چھتیس کے بجائے بتیس سمجھتے تھے اور چھ چھکے چھتیس کہنے کے بجائے چھ چھکے بتیس ہی کہتے تھے۔ اُنہیں پختہ یقین تھا کہ چھ ضرب چھ چھتیس نہیں ہوتے بلکہ بتیس ہوتے ہیں اور جو لوگ اُنہیں چھتیس سمجھتے ہیں وہ غلط سمجھتے ہیں اور حماقت کا اظہار کرتے ہیں!

اس مسئلے پر کئی مرتبہ اُن کی ریاضیات کے پروفیسروں سے بحث بھی ہوئی اور فزکس کے اُستادوں کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا۔ شماریات والوں نے بھی احتجاج کیا اور کمپیوٹر سائنس دانوں نے بھی مختلف کمپیوٹروں پر اُنہیں بار بار ملٹی پلائی کر کے دکھایا لیکن اُن کی تسلی نہ ہوئی۔ تسلی ہونا تو ایک طرف، اُنہوں نے اس ایکویشن کو تسلیم ہی نہیں کیا۔

لیکن جب اُن کے مد مخالف گروہ نے پروفیسر ساعتی سے چھ چھکے بتیس ہونے کا ثبوت مانگا تو اُنہوں نے کہا "میں اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتا، عین اس طرح جس طرح ہم سارے ریاضیاتی قاعدوں اور کلیوں کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن میں اپنے اس پہاڑے کے زور پر سارے سوالوں کے صحیح جواب نکال سکتا ہوں اور آپ کی تشفی کر سکتا ہوں" — اُن کے اس جواب دعوے پر پہلے تو اُن کے ساتھی پروفیسروں نے اُنہیں اپنی مہارتی کی منطق پر عام سوال حل کرنے کے لئے دیئے اور جب اُنہوں نے، اُن کے سامنے، بڑی آسانی کے ساتھ سارے سوالوں کے جواب چھ ضرب چھ بتیس مان کر نکال دیئے تو پروفیسروں کی سٹی گم ہو گئی۔

پھر اُن لوگوں نے پروفیسر ساعتی کو کچھ مشکل اور پیچیدہ سوال دیئے اور جب اُنہوں نے وہ بھی اپنے حساب سے حل کر کے دکھا دیئے تو پھر اُنہیں فکر پڑی اور یہ معاملہ فزکس کے پروفیسروں تک پہنچا دیا گیا۔

فزکس کے پروفیسروں نے کشش، رفتار، روشنی اور ولاسٹی کے سوال دے کر کہا "ساعتی صاحب ذرا دھیان رکھنا۔ ذرا سی بھی غلطی ہو گئی تو شٹل نے زمین پر گر جانا ہے اور ہزاروں جانوں کا نقصان ہو جانا ہے۔"

پروفیسر ساعتی نے مسکرا کر کہا "کوئی بات نہیں جی، اللہ فضل کرے گا۔ اللہ مہربانی کرے گا۔" پھر اُنہوں نے چھ ضرب چھ کو بتیس مان کر حرکیات کے ایک پیچیدہ مسئلے کو جو حل کرنا شروع کیا تو پندرہ بیس منٹ میں مفروضے کے ریوڑ کے گرد گڈریئے کی طرح چکر لگا کر ٹھک سے رکے اور کھٹ سے اس کا جواب نکال کر سامنے رکھ دیا۔

پروفیسر شفیق نے کہا "سر! یہ جو بتیس میں چار کی کمی رہ جاتی ہے، وہ آپ کس طرح سے پوری کرتے ہیں؟"

پروفیسر ساعتی نے خوش ہو کر شفیق صاحب کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا "مقام شکر ہے کہ کسی نے پوچھا تو ورنہ ابھی تک تو سارے میرے ساتھ لڑتے ہی رہے ہیں۔"

پھر اُنہوں نے فزکس کے پروفیسر شفیق اور شماریات کے پروفیسر جواد کو ساتھ بٹھا کر اپنا فارمولا سمجھانا شروع کر دیا۔

پروفیسر صاحب اپنی ساری بین الاقوامی شہرت کے باوصف پچھلے اٹھارہ برس سے لیکچرر ہی چلے آ رہے تھے اور یہ ساری مدت اُنہوں نے بہاول نگر کے کالج میں ہی گزار دی تھی۔

جب کبھی پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو کا زمانہ آتا اور لیکچرروں کے اسسٹنٹ پروفیسر بننے کے چانس قریب آتے تو پروفیسر ساعتی بھی اعلیٰ درجے کا سوٹ زیب تن کئے، غیر ملکی رسالوں میں اپنے چھپے مقالوں کا پلندہ اُٹھائے اور غیر ملکی حکومتوں کے شکریے کے خطوں کی فائل بغل میں دبائے انٹرویو کے لئے پہنچ جاتے۔

لیکن پروفیسر صاحب کے حاسد اور بدخواہ ہمعصر اُستاد انٹرویو بورڈ کے ہر ممبر کو ایک چھوٹی سی چٹ لکھ کر اندر بھجوا دیتے کہ پروفیسر ساعتی سے انٹرویو کے دوران یہ ضرور پوچھیے گا کہ چھ چھکے کتنے ہوتے ہیں، اس سے آپ کو اُن کی دماغی حالت کا خود اُن کی زبانی پتہ چل جائے گا۔

پروفیسر صاحب انٹرویو دے کر ہمیشہ خوش خوش باہر نکلتے اور گھر والوں کو جا کر کامیابی کا مژدہ سناتے لیکن نتیجہ نکلنے پر وہ لیکچرر کے لیکچرر ہی رہ جاتے۔ انٹرویو کے آخر میں اُن سے ہر بار "چھ چھکے —" پوچھا جاتا اور وہ ہر بار بتیس بتا کر گھر واپس آ جاتے۔

ایک مرتبہ جب پروفیسر ساعتی سوڈان میں اسلامک اکنامکس پر چھ لیکچر دے کر واپس لوٹے تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دم سے ایک باعزت اور قابل توجہ شخصیت بن گئے ہیں اور اُن کی نگرانی ہونے لگی ہے۔ کالج میں، کلاس کے اندر، گھر سے باہر، کھلے میدان میں جہاں کہیں وہ جاتے، ایک سایہ سا اپنے قرب و جوار میں محسوس کرتے۔ وہ تو اس سائے کو اپنی عزت افزائی پر محمول کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بڑے آدمیوں کے سائے بھی لمبے مستقیم کا قطر ہوتے ہیں لیکن اصل میں یہ بات نہیں تھی.... وہ لمبا سایہ اُن کا اپنا نہیں تھا بلکہ لمبے ہاتھوں والے کا سایہ تھا۔

اُنہی دنوں ہمارے بادشاہ کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اور اپنے غیر ملکی سفیروں کے لئے روپے کی شدید ضرورت آ پڑی تھی۔ وہ لگان لگا کر اور ڈنڈ بھروا کر اپنی رعایا سے اتنی رقم نکلوا سکتا تھا لیکن اس عمل سے اس کی رعایا کے ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اور چونکہ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ اس کے عوام تھے اس لئے بادشاہ نے اب کی بار قرض لینے کی ٹھانی۔ اس نے ادھر اُدھر قاصد دوڑائے اور قرض دینے والوں نے اس کی طرف گماشتے بھگائے اور جب یہ دونوں بھاگ کر ہونکنے لگے تو اُنہوں نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہ سلامت کو ورلڈ بنک سے قرض لے دیتے ہیں۔ ایک تو یہ قرضہ بادشاہ سلامت کی ضرورت سے دوگنا ہو گا کہ ورلڈ بنک ایک خاص تعداد سے کم قرض جاری کرنے سے معذور ہے، دوسرے اس قرض پر سود بہت کم ہو گا جو ہر سال اضافے کے لئے بادشاہ سلامت سے منظوری لے کر اصل زر میں داخل کیا جاتا رہے گا۔

بادشاہ سلامت کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اُنہوں نے قرضہ جاری کرنے کی درخواست دے دی۔ تین دن کے اندر اُن کی درخواست منظور ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی قرضہ جاری کرنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔ لیکن —— !

قرضے کی رقم پہنچنے کے بجائے بادشاہ سلامت کے پاس ورلڈ بنک کے تین سفارتی نمائندے پہنچ گئے جن کا تعلق امریکا، انگلستان اور بلجیم سے تھا۔ اُنہوں نے بڑے ادب کے ساتھ جھک کر بادشاہ سلامت کو سلام کیا اور اپنے کاغذات اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

ایک مرتبہ جب پروفیسر ساعتی سوڈان میں اسلامک اکنامکس پر چھ لیکچر دے کر واپس لوٹے تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دم سے ایک باعزت اور قابل توجہ شخصیت بن گئے ہیں اور اُن کی نگرانی ہونے لگی ہے۔ کالج میں، کلاس کے اندر، گھر سے باہر، کھلے میدان میں جہاں کہیں وہ جاتے، ایک سایہ سا اپنے قرب و جوار میں محسوس کرتے۔ وہ تو اس سائے کو اپنی عزت افزائی پر محمول کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بڑے آدمیوں کے سائے بھی لمبے مستقیم کا قطر ہوتے ہیں لیکن اصل میں یہ بات نہیں تھی.... وہ لمبا سایہ اُن کا اپنا نہیں تھا بلکہ لمبے ہاتھوں والے کا سایہ تھا۔

اُنہی دنوں ہمارے بادشاہ کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اور اپنے غیر ملکی سفیروں کے لئے روپے کی شدید ضرورت آ پڑی تھی۔ وہ لگان لگا کر اور ڈنڈ بھروا کر اپنی رعایا سے اتنی رقم نکلوا سکتا تھا لیکن اس عمل سے اس کی رعایا کے ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اور چونکہ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ اس کے عوام تھے اس لئے بادشاہ نے اب کی بار قرض لینے کی ٹھانی۔ اس نے ادھر اُدھر قاصد دوڑائے اور قرض دینے والوں نے اس کی طرف گماشتے بھگائے اور جب یہ دونوں بھاگ کر ہونکنے لگے تو اُنہوں نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہ سلامت کو ورلڈ بنک سے قرض لے دیتے ہیں۔ ایک تو یہ قرضہ بادشاہ سلامت کی ضرورت سے دوگنا ہو گا کہ ورلڈ بنک ایک خاص تعداد سے کم قرض جاری کرنے سے معذور ہے، دوسرے اس قرض پر سود بہت کم ہو گا جو ہر سال اضافے کے لئے بادشاہ سلامت سے منظوری لے کر اصل زر میں داخل کیا جاتا رہے گا۔

بادشاہ سلامت کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اُنہوں نے قرضہ جاری کرنے کی درخواست دے دی۔ تین دن کے اندر اُن کی درخواست منظور ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی قرضہ جاری کرنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔ لیکن — !

قرضے کی رقم پہنچنے کے بجائے بادشاہ سلامت کے پاس ورلڈ بنک کے تین سفارتی نمائندے پہنچ گئے جن کا تعلق امریکا، انگلستان اور بلجیم سے تھا۔ اُنہوں نے بڑے ادب کے ساتھ جھک کر بادشاہ سلامت کو سلام کیا اور اپنے کاغذات اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

ایک مرتبہ جب پروفیسر ساعتی سوڈان میں اسلامک اکنامکس پر چھ لیکچر دے کر واپس لوٹے تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دم سے ایک باعزت اور قابل توجہ شخصیت بن گئے ہیں اور اُن کی نگرانی ہونے لگی ہے۔ کالج میں، کلاس کے اندر، گھر سے باہر، کھلے میدان میں جہاں کہیں وہ جاتے، ایک سایہ سا اپنے قرب و جوار میں محسوس کرتے۔ وہ تو اس سائے کو اپنی عزت افزائی پر محمول کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بڑے آدمیوں کے سائے بھی لمبے مستقیم کا قطر ہوتے ہیں لیکن اصل میں یہ بات نہیں تھی.... وہ لمبا سایہ اُن کا اپنا نہیں تھا بلکہ لمبے ہاتھوں والے کا سایہ تھا۔

اُنہی دنوں ہمارے بادشاہ کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اور اپنے غیر ملکی سفیروں کے لئے روپے کی شدید ضرورت آ پڑی تھی۔ وہ لگان لگا کر اور ڈنڈ بھروا کر اپنی رعایا سے اتنی رقم نکلوا سکتا تھا لیکن اس عمل سے اس کی رعایا کے ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اور چونکہ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ اس کے عوام تھے اس لئے بادشاہ نے اب کی بار قرض لینے کی ٹھانی۔ اس نے ادھر اُدھر قاصد دوڑائے اور قرض دینے والوں نے اس کی طرف گماشتے بھگائے اور جب یہ دونوں بھاگ کر ہونکنے لگے تو اُنہوں نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہ سلامت کو ورلڈ بنک سے قرض لے دیتے ہیں۔ ایک تو یہ قرضہ بادشاہ سلامت کی ضرورت سے دوگنا ہو گا کہ ورلڈ بنک ایک خاص تعداد سے کم قرض جاری کرنے سے معذور ہے، دوسرے اس قرض پر سود بہت کم ہو گا جو ہر سال اضافے کے لئے بادشاہ سلامت سے منظوری لے کر اصل زر میں داخل کیا جاتا رہے گا۔

بادشاہ سلامت کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اُنہوں نے قرضہ جاری کرنے کی درخواست دے دی۔ تین دن کے اندر اُن کی درخواست منظور ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی قرضہ جاری کرنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔ لیکن ——!

قرضے کی رقم پہنچنے کے بجائے بادشاہ سلامت کے پاس ورلڈ بنک کے تین سفارتی نمائندے پہنچ گئے جن کا تعلق امریکا، انگلستان اور بلجیم سے تھا۔ اُنہوں نے بڑے ادب کے ساتھ جھک کر بادشاہ سلامت کو سلام کیا اور اپنے کاغذات اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

ایک مرتبہ جب پروفیسر ساعتی سوڈان میں اسلامک اکنامکس پر چھ لیکچر دے کر واپس لوٹے تو اُنھوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دم سے ایک باعزت اور قابل توجہ شخصیت بن گئے ہیں اور اُن کی نگرانی ہونے لگی ہے۔ کالج میں، کلاس کے اندر، گھر سے باہر، کھلے میدان میں جہاں کہیں وہ جاتے، ایک سایہ سا اپنے قرب و جوار میں محسوس کرتے۔ وہ تو اس سائے کو اپنی عزت افزائی پر محمول کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بڑے آدمیوں کے سائے بھی لمبے مستقیم کا قطر ہوتے ہیں لیکن اصل میں یہ بات نہیں تھی.... وہ لمبا سایہ اُن کا اپنا نہیں تھا بلکہ لمبے ہاتھوں والے کا سایہ تھا۔

اُنہی دنوں ہمارے بادشاہ کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اور اپنے غیر ملکی سفیروں کے لئے روپے کی شدید ضرورت آ پڑی تھی۔ وہ لگان لگا کر اور ڈنڈ بھروا کر اپنی رعایا سے اتنی رقم نکلوا سکتا تھا لیکن اس عمل سے اس کی رعایا کے ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اور چونکہ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ اس کے عوام تھے اس لئے بادشاہ نے اب کی بار قرض لینے کی ٹھانی۔ اس نے ادھر اُدھر قاصد دوڑائے اور قرض دینے والوں نے اس کی طرف گماشتے بھگائے اور جب یہ دونوں بھاگ کر ہونکنے لگے تو اُنھوں نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہ سلامت کو ورلڈ بنک سے قرض لے دیتے ہیں۔ ایک تو یہ قرضہ بادشاہ سلامت کی ضرورت سے دوگنا ہو گا کہ ورلڈ بنک ایک خاص تعداد سے کم قرض جاری کرنے سے معذور ہے، دوسرے اس قرض پر سود بہت کم ہو گا جو ہر سال اضافے کے لئے بادشاہ سلامت سے منظوری لے کر اصل زر میں داخل کیا جاتا رہے گا۔

بادشاہ سلامت کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اُنھوں نے قرضہ جاری کرنے کی درخواست دے دی۔ تین دن کے اندر اُن کی درخواست منظور ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی قرضہ جاری کرنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔ لیکن — !

قرضے کی رقم پہنچنے کے بجائے بادشاہ سلامت کے پاس ورلڈ بنک کے تین سفارتی نمائندے پہنچ گئے جن کا تعلق امریکا، انگلستان اور بلجیم سے تھا۔ اُنھوں نے بڑے ادب کے ساتھ جھک کر بادشاہ سلامت کو سلام کیا اور اپنے کاغذات اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

وزیر خزانہ نے بادشاہ کے حکم سے اُس محضرنامے کو بھرے دربار میں سنانا شروع کر دیا۔ لکھا تھا کہ ورلڈ بنک بادشاہ سلامت کی ضرورت اور خواہش کے مطابق اُن کو قرضے کی رقم بھجوا رہا ہے اور کرنسی کا انتخاب اُنہی پر چھوڑتا ہے کہ جس ملک کی کرنسی میں چاہیں رقم لے لیں اور جس لمحہ چاہیں یہ رقم اپنے تصرف میں لے آئیں لیکن اس کے لئے اُنہیں ایک اہم شرط کی تکمیل کرنی پڑے گی اور وہ یہ ہے کہ اس قرضے کی پوری رقم، اصل مع سود، ادا ہونے تک پروفیسر ساعتی کو قید کر کے کڑے پہرے میں رکھا جائے گا اور کسی کو ان سے ملنے نہیں دیا جائے گا۔ اس شرط پر وزیر خزانہ رُک گیا تو بادشاہ سلامت نے حیرت سے پوچھا "یہ پروفیسر ساعتی کون ہے؟"

وزیر خزانہ نے سر جھکا کر کہا "ایک ٹیچر ہے سر، بہاول نگر کالج میں اکنامکس پڑھاتا ہے اور اٹھارہ سال کی سروس کے بعد ابھی تک لیکچرر ہی ہے۔"

"کیوں، لیکچرر کیوں ہے؟" بادشاہ سلامت نے پوچھا۔

وزیر خزانہ نے مسکرا کر اور کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا "وہ ذرا مخبوط الحواس سا شخص ہے عالم پناہ اور اس کے ذہن میں ایک ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے۔"

"ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے!" بادشاہ سلامت نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی سر!" فنانس منسٹر نے سر جھکا کر کہا "وہ چھ چھیک چھتیس کے بجائے چھ چھیک بتیس بتاتا ہے اور چھ ضرب چھ کا حاصل ضرب بتیس ہی سمجھتا ہے۔"

"اور وہ اب تک کالج میں پڑھا رہا ہے۔" بادشاہ نے غصے سے پوچھا۔

"جی سر" وزیر خزانہ نے ذرا سا رُک کر کہا "ہم نے وزیر تعلیم سے بات کی تھی اور یہ سقم اُن کے نوٹس میں لائے تھے لیکن اُنہوں نے کمیٹی رپورٹ کے بعد اور پھر خود انٹرویو کر کے یہ فیصلہ دیا کہ پروفیسر مذکور کے ذہن میں سوائے اس معمولی سی اٹکن کے اور کوئی خرابی نہیں — وہ بہت پڑھے لکھے اور عالمی شہرت کے ماہر اقتصادیات ہیں، اس لئے اُنہیں رہنے دیا جائے۔"

"یہ بہت بڑی خرابی ہے یور میجسٹی" بنک کے بلجیئن نمائندے نے کہا "یہ معمولی اٹکن نہیں ہے جیسا کہ وزیر خزانہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ ایک سنجیدہ اور خطرناک عارضہ ہے۔"

"جو آگے بڑھ کر ایک وبا کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔" بنک کے انگلستانی نمائندے نے بات کاٹ کر کہا۔

وزیر خزانہ نے وضاحت کرنے کے لئے ہاتھ اُوپر اُٹھایا تو بنک کے بلجیئن نمائندے نے مسکرا کر کہا "پروفیسر صاحب کی یہ خرابی جسے وزیر خزانہ صاحب معمولی الجھن کہہ رہے ہیں، ہمارے آپ کے تعلقات کی سب سے بڑی اڑچن بن سکتی ہے۔"

"اڑچن بن سکتی ہے!" بادشاہ نے نگاہیں اُوپر اُٹھا کر اُونچی آواز میں دہرایا۔

"نہیں حضور" وزیر خزانہ نے ڈرتے ہوئے کہا "یہ اُن کا وہم ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

بنک کے امریکی نمائندے نے نفی میں سر ہلایا گویا کہہ رہا ہو کہ وزیر خزانہ صاحب کی یہ بات کم علمی پر مبنی ہے۔

انگلستان کے نمائندے نے کہا "یور رائل میجسٹی کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ عام چال سوچ سے الگ ہو کر سوچنے والا آدمی مملکت کے لئے اور حکومت کے لئے کس قدر خطرناک ہوا کرتا ہے۔ اس کی مختلف قسم کی سوچ کی ذرا سی چنگاری ساری بادشاہیت کو جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔ اس لئے ہم پروفیسر ساعتی کے اس معمولی سے فتور ذہنی سے کافی متفکر ہیں۔"

پہلے تو اکیلے بادشاہ سلامت ہی اس احمقانہ دلیل پر حیرت زدہ بیٹھے تھے، اب اُن کے ساتھ وزیر خزانہ بھی شامل ہو گئے۔ اُنہوں نے حیران ہو کر کہا "میں عالمی شہرت رکھنے والے اتنے بڑے بنک کے ایسے ذہین بنکاروں کی دلیل سن کر سخت متحیر ہوا ہوں۔ میرے نزدیک یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے اور ایسا خیال بہت ہی ابتدائی اور غیر مہذب دور سے تعلق رکھتا ہے۔"

وزیر خزانہ کی یہ بات سن کر بنک کے امریکن نمائندے نے کہا "وزیر خزانہ صاحب! ہماری سوچ اور ہمارا تصور ازمنہ قدیم کے دور سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ آپ کا انداز اس غیر مہذب عہد کی عکاسی کر رہا ہے جب لوگ بلا سوچے سمجھے ڈھور ڈنگروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ پروفیسر ساعتی کا طے شدہ قاعدے سے انحراف خطرے کی ایک گھنٹی ہے۔ یہ صرف اُن کی ذہنی کج روی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے

پورا ایک سسٹم کام کر رہا ہے جس سے آپ سب بے خبر ہیں۔"
وزیرِ خزانہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے علم کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ زیادہ سے زیادہ پروفیسر صاحب کو ایک اوٹسٹ قرار دے سکتے ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہماری زبان میں ایسے لوگوں کو "سائیں" کہتے ہیں۔"

بنک کے امریکی نمائندے نے کہا "یور میجسٹی! آج تک دُنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں اور جس قدر اتھل پتھل ہوئی ہے، وہ سب ایسے ہی لوگوں کی بدولت ہوئی ہے — بظاہر پروفیسر صاحب کا انحراف کہ چھ چھکے بتیس ہوتے ہیں، ایک معمولی سی ذہنی گمراہی نظر آتی ہے مگر یہ کینسر کے ایک خلیئے کی طرح سارے بدن میں پھیل سکتا ہے اور اس کی کئی شاخیں پھوٹ کر دور دور تک پھیل سکتی ہیں۔ ہم ایسی کج رویوں سے اور اس قسم کے ذہنی فتور سے بہت ڈرتے ہیں کہ ہمارے کندھوں پر امن عالم برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہے۔ ہم نے انسانیت کے سمندر میں سمود سیلنگ کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہے اور ہم ہر کام میں طے شدہ اقدار کے حامل ہیں۔"

"لیکن ان ساری باتوں کا پروفیسر ساعتی کی ذہنی کج روی سے کیا تعلق؟" وزیرِ خزانہ نے قدرے غصے سے پوچھا۔

"گہرا تعلق بلکہ بہت ہی گہرا تعلق" بنک کے امریکی نمائندے نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "ہمارے عظیم الشان اور پروقار عالمی ادارے کی کارکردگی کو ایسے لوگوں سے شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" بادشاہ سلامت نے بڑے بھاؤ سے پوچھا "وہ کس طرح؟"

"وہ ایسے سر" بلجیئن نمائندے نے گلا صاف کر کے کہا "کہ پروفیسر ساعتی جیسا شخص جو دُنیا کے طے شدہ قاعدے سے ایک مقام پر انحراف کرتا ہے، وہ کسی اور طے شدہ اور مستقل قاعدے سے اس سے بھی بڑھ کر انحراف کر سکتا ہے۔"

"مثلاً؟" وزیرِ خزانہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "کس طرح؟"

"وہ اس طرح یور میجسٹی!" بنک کے امریکی نمائندے نے کہا "کہ طے شدہ اور معروف عام قاعدے کا منحرف ایک روز یہ اعلان بھی کر سکتا ہے کہ بلا سود بھی بنکاری ہو سکتی ہے۔ اور بلا سود بھی تجارت کا چلنا اسی طرح سے قائم رہ سکتا ہے، یا صنعت و

حرفت کا تانا بانا سودی کاروبار کے علاوہ بھی اس دُنیا میں چل سکتا ہے اور سود کے بغیر بھی یہ دُنیا قائم رہ سکتی ہے بلکہ بہتر طور پر قائم رہ سکتی ہے.... خوشیوں اور مسکراہٹوں کی لپیٹ میں، آسانیوں اور کامرانیوں کے گہوارے میں!"

بادشاہ سوچ میں پڑ گیا تو وزیرِ خزانہ نے کہا "جنٹلمین! پھر تو یہ ایک اچھی بات ہو گی کہ — " لیکن اس کی بات کو انگلستانی نمائندے کی گرج دار اور گستاخ "No" نے بیچ ہی میں کاٹ دیا۔ وہ ایک تھکے ہوئے خوبصورت کتے کی طرح ہانپتے ہوئے بولا "ایسی خوف ناک اور منحوس بات مثال کے طور پر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے سارے نظام کائنات کے درہم برہم ہونے کا اندیشہ ہے۔"

امریکی نے معذرت کرتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ..... کہ گاڈ فاربڈ..... کبھی ایسا ہو گا یا ہو سکے گا، میں نے تو صرف سمجھانے کے لئے ہزمیجسٹی کو ایک مثال دی تھی۔"

بادشاہ نے سنجیدہ چہرہ بنا کر اور اس سارے مکالمے سے متاثر ہو کر وزیرِ خزانہ سے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ بنک کے ان فاضل نمائندوں کے دلائل بڑے وزنی ہیں اور ہمیں انہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔"

"خاص طور پر ایسے وقت میں جب آپ کو روپے کی اشد ضرورت ہو" بلجیئن نمائندے نے کہا "اور ورلڈ بنک آپ کو رعائتی نرخوں پر قرض فراہم کر رہا ہو۔"

انگلستانی نمائندے نے کہا "پھر کیا خیال ہے؟ ہم تو آپ کے لئے پے منٹ لے کر آئے تھے اور ہر طرح کی کرنسی میں لے کر آئے تھے۔"

"آپ چاہے ڈالر لے لیں" امریکی نمائندے نے کہا "چاہے پاؤنڈ لے لیں، چاہے ین یا ڈوش مارک لے لیں۔ ہمارے پاس ہر طرح کا سودا موجود ہے۔"

بلجیئن نمائندے نے کہا "بہتر تو یہی ہے یوئر میجسٹی کہ آپ ملا کر ساری کرنسیاں لے لیں۔ آپ کے کام آئیں گی۔ آپ کو باہر اندر آنا جانا پڑتا ہے۔"

چونکہ اس وقت ایک مطلق العنان بادشاہ یہاں حکمران تھا اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اس لئے بادشاہ نے حکم دیا کہ "ہمارے مہمانانِ گرامی غیر ملکی نمائندے جو قرضے کی بوجھل رقم اُٹھا کر یہاں تشریف لائے ہیں، اگر مناسب سمجھیں تو ہماری رعایا

کے ایک فرد، چالاو سوچ کے منحرف پروفیسر ساعتی کو خود گرفتار کر کے لے جائیں اور اپنے ملک کے کسی قید خانے میں قید کر دیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اور اگر ہم پر اعتبار کریں تو اُسے بے شک ہماری سلطنت کے کسی بھی پسندیدہ قید خانے میں ڈال کر اپنا تالا لگا دیں اور چابی اپنے ساتھ لے جائیں۔"

بنک کے نمائندوں نے سر جھکا کر اور یک زبان ہو کے کہا "یور میجسٹی! آپ بے شک اپنا تالا چابی لگائیں، ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے۔ ہم نے چابی ساتھ لے جا کر کیا کرنی ہے!"

سعید جونیئر

سعید احمد تھا تو ایک پاک باز اور نیک نہاد گھرانے کا فرزند لیکن فورتھ ایئر کے شروع میں اس پر ترقی کرنے کا ایسا بھوت سوار ہوا کہ اُس نے اپنے گھرانے کی ساری روایات کو خاکی کاغذ میں پیک کر کے اُن پر ربڑ کے چھلے چڑھا دیئے اور پھر اس پیکج کو چھوٹی کوٹھڑی کے کاٹھ کباڑ میں پھٹوں کے نیچے ڈال کر اُوپر پرانے گدے، پھٹی ہوئی بوریاں اور گودڑ پھونس کے انبار ڈال دیئے۔

سعید احمد کے والد مولوی نور محمد، سوڑی گلی کی مسجد کے پیش امام تھے اور بڑی دھیمی آواز میں گفتگو کرتے تھے۔ اُن کی مدھم اور نرم نازک گفتگو سن کر کوئی یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ وہ مولوی ہیں اور چھوٹی مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ سب اُن کو صوفی صاحب کہہ کر بلاتے تھے اور وہ صوفی ہی سمجھتے تھے۔

صوفی صاحب عمر بھر اپنی سائیکل میں نئی بریکیں نہ ڈلوا سکے اور اگلے پہیئے پر زور کا پاؤں دبا کر اُسے روکتے رہے۔ اُن کی سائیکل میں ایک طرف تو پیڈل تھا لیکن دوسری طرف صرف کلی تھی جو چپل کی رگڑ سے میخ کی طرح پتلی اور میخ ہی کی طرح نوکیلی ہو گئی تھی۔

جب سعید احمد فرسٹ ایئر میں داخل ہوا تو صوفی صاحب اپنے سہ سالہ اینجائنا کی بدولت صحن مسجد ہی میں فوت ہو گئے اور وہیں نمازیوں نے اُنہیں غسل دے کر اور کفنا کر گھر بھیج دیا۔ اُنہی دنوں اتفاق سے اُن کی بیٹی اپنے پہلے بچے کو جنم دینے گھر آئی ہوئی تھی اور دائی جنائی کے لئے پانچ سو روپے ساتھ لے کر آئی تھی کہ ابا جی پر بوجھ نہ پڑے۔ لیکن ابا جی نے اپنے جنازے کا سارا بوجھ اس غریب پر ڈال دیا اور اس کا شوہر

دسویں کے بعد ہی اُسے اپنے ساتھ واپس شکرگڑھ لے گیا کہ بیوہ ساس پر زچگی کا خرچہ نہ پڑے۔

محمد الیاس شکرگڑھ کا ایک آسودہ حال دفتری تھا جس کے پاس سکول کے بچوں کی کتابوں کے علاوہ تحصیل کے کھلے کاغذات کی جلد بندی کا کام بھی آجاتا تھا۔ وہ ہر مہینے اپنی بچت سے دس روپے کا ایک انعامی بانڈ خرید کر اپنی دوکان کی واحد الماری کے سب سے نچلے خانے کے اُس بوسیدہ رجسٹر میں رکھ لیتا تھا جس پر کسی کو شک بھی نہ گزر سکتا تھا کہ اس میں انعامی بانڈ بھی ہو سکتے ہیں۔

صوفی صاحب کی بیوہ نے صبح محلے کی لڑکیوں کو قرآن پڑھا کر اور دن کے وقت دو گھروں کی روٹی ہانڈی کی نوکری کر کے سعید کو بی اے کرایا۔ اور جب وہ بی اے کر چکا تو اس نے چنگی محرر کے طور پر کمیٹی کی نوکری کر لی اور بڑی گربہ پائی کے ساتھ آسودگی کی طرف بڑھنے لگا۔

سعید نے اپنے باپ کی سائیکل، ماں کی بیوگی، بہنوئی کی جلدسازی اور اپنی بیکی کے تسلسل میں ایک طویل سفر کیا تھا اس لئے اپنی لیٹ نکالنے کو اس نے ترقی کا محل اٹھانے کو تیز تر کر دیا اور رشوت کے حرام سے اپنی آسودگی کے حمام کو گرم کرنا شروع کر دیا — جلد ہی وہ ایک رشوت خور کارندے کی حیثیت سے سارے شہر میں مشہور ہو گیا۔

دوکاندار، آڑھتی، کارخانے دار اور امپورٹر وغیرہ بددیانت کارندے کا دل سے احترام کرتے ہیں اور اس کی بددیانتی کو تقویت عطا کرنے کے لئے ہر مشکل مقام میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ سعید احمد کو بھی یہ سہارا مفتا مفت فراہم ہو گیا اور وہ شہر کے معزز لوگوں کی انجمن کا معمولی رکن بننے کے لئے نامزدگی کے دائرے میں آ گیا۔

جب اس کی ماں کو اپنے بیٹے کی اس خصوصیت کا علم ہوا تو اس نے اپنے برتن علیحدہ کر لئے اور رو رو کر ٹوٹی سائیکل والے صوفی صاحب کو یاد کرنے لگی جو اپنے پہلوٹی کے بچے کی آمد سے پہلے اپنی بیوی کو دو آنے کی کھڑیا مٹی بھی لا کر نہ دے سکے تھے!

سعید احمد بے ایمان، لالچی، ہوس ناک یا حرصی پٹھا نہیں تھا۔ وہ زمانے کے

برابر آنے کا اور اشرافیہ میں داخل ہونے کا خواہش مند تھا۔ وہ تو صرف اپنی کھوئی ہوئی عزت کو واپس لانے کے لئے بے چین تھا جو اس کے بزرگوں نے شرافت اور نیکی کے ہاتھوں سستے داموں فروخت کر دی تھی۔

اس نے شہر کی معزز آبادی میں ایک کنال کا پلاٹ خرید لیا۔ چھوٹی موٹر کا ایڈوانس جمع کرا دیا۔ اچھی خاصی رقم قومی بچت سکیم میں لگا دی اور ایک ایسے گھر آنا جانا شروع کر دیا جہاں دوسرے معزز لوگ بھی آتے جاتے تھے۔

سعید کی والدہ نے پہلے تو اس سے برتن علیحدہ کئے پھر وہ خود اس سے علیحدہ ہو کر درزیوں کی کٹڑی میں چلی گئی۔ پرانے زمانے کی عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ قدروں کی بھی پالن ہار تھیں۔ مردوں کی بے راہ روی میں اُن کے ساتھ شامل نہیں ہوتی تھیں بلکہ اُن کے خلاف اعلان جنگ کر دیتی تھیں۔ پرانے زمانے کی عورتیں بڑی آزاد، بے خوف اور خود مختار ہوتی تھیں۔ مردوں کے ساتھ نہ تو اُن کی برائیوں میں شرکت کرتیں نہ اُن کے کرتوتوں پر چشم پوشیوں کے سرپوش ڈال کر اُنہیں مستور کرتی تھیں۔ معاشرتی اقدار کے معاملے میں اُن کے گھروں کی قلعہ بندیاں بڑی مضبوط تھیں اور ساری بستیاں اُنہی کے دم قدم سے آباد تھیں۔ پرانی عورتیں اقدار کی محافظ تھیں اس لیے اپنے فیصلوں میں بڑی آزاد تھیں۔

سعید احمد کو اپنی ساری مالی چکا چوند کے باوصف ایک ایسے اوزار کی ضرورت تھی جو اس کے لاٹری کے ٹکٹوں، انعامی بانڈوں اور معموں کے حلوں کو پھلنے پھولنے میں اس کی مدد کر سکے اور اُن کی بر آوری یقینی بنا سکے۔ اس نے کچھ جوگیوں، عاملوں، چلہ کشوں اور جوتشیوں سے رابطہ کر کے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا کام شروع کیا مگر جب اُسے اُن کی چرب زبانی، چیرہ دستی اور ٹھگ بازی سے اچھا خاصا نقصان پہنچ گیا تو اس نے اُن سے ہر طرح کا تعلق ختم کر کے خود اس راہ کی تلاش شروع کر دی۔

سعید کے والد کی کتابوں میں کچھ قاعدے اور پمفلٹ ایسے بھی تھے جن میں وظائف اوراد کا ذکر تھا۔ کچھ کتابیں تعویزوں کی تھیں اور کچھ رسالوں میں سلوک کی منازل طے کرنے کے طریق بتائے گئے تھے۔ ایک دو ڈائریاں تھیں جن میں صوفی صاحب نے اپنی قلبی واردات اور روحانی تجربات کا ذکر کیا تھا۔ ایک لمبا رجسٹر اُن کے

خوابوں کا تھا اور ایک پلندہ روحانی دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کا تھا۔
اس نے اپنے ابا جی کی ڈائری سے اسمائے حسنیٰ کا ایک ایسا چھوٹا جوٹا نکالا جس کے اعداد اُس کے اپنے نام کے اعداد کے مطابق تھے۔ ہدایات کے مطابق اُس نے اُن اعداد کو دوگنا کر کے اُن اسمائے حسنیٰ کا ورد صبح و شام کے لیے اپنا لیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اگر کوئی شخص یا بدیع العجائب بالخیر یا بدیع کا ورد عشاء کی نماز کے بعد بارہ سو مرتبہ کرے تو اس کی مشکل سے مشکل خواہش چالیس دن کے اندر اندر پوری ہو جاتی ہے۔ اس ورد کی خاطر سعید نے عشاء کی نماز بھی شروع کر دی۔ پھر کسی کے بتانے پر اُس نے پاس انفاس کو بھی اپنا لیا۔
مولوی کا بیٹا ہمیشہ دھن کا پکا اور کام کا پورا ہوتا ہے۔ وہ جب بھی تجارت، سیاست یا صنعت کے میدان میں اُترتا ہے تو دُنیاداروں کے بیٹوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے اندر اپنے بزرگوں کے عزم کی وہ مضبوط ڈوری تانت کی طرح بجتی ہے جو سخت سردیوں میں کورے گھڑے سے وضو کرنے کے بعد اور سخت گرمیوں میں پکے فرش پر نماز گزارنے سے پیدا ہوتی ہے۔
سعید نے اپنے پانچوں شرعی عیبوں کے ساتھ ساتھ اَوراد و اذکار کا سلسلہ پابندی کے ساتھ جاری رکھا مگر ایک بھی انعام نہ جیت سکا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے لاٹری ٹکٹوں اور انعامی بانڈوں کو تو بھول گیا لیکن ذکر کے اس آرے کو نہ روک سکا جو اس کے اندر ایک عجیب دُند کے ساتھ چل رہا تھا۔ اگر تو اس آرے کی کاٹ سعید کے نفس پر ہوتی پھر تو اُسے کافی فائدہ ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ رُوح اپنی منازل طے کرتی رہتی ہے لیکن نفس اپنی جگہ پر اور موٹا ہو جاتا ہے..... جیسے بے حد مضبوط اور کسرتی بدن ایک کمزور سے جی دار کے سامنے خم کھا جاتا ہے۔ ورزش بدن کو مضبوط ضرور کر دیتی ہے لیکن دلیری اور پامردی کی گارنٹی نہیں دیتی۔ ورد، وظیفے، نماز، ریاض اور عبادات رُوح کو بالیدہ کر دیتے ہیں لیکن بدی، برائی، بدچلنی کو رندہ نہیں لگتا..... اس دشت سے کوئی لکڑہارا ہی نکال سکتا ہے۔ یہاں کوئی مرجینا ہی ہاتھ پکڑ کر علی بابا کے دروازے پر لے جا سکتی ہے۔ خود نہیں جایا جاتا!
سردیوں کی ایک تاریک اور طویل رات میں کندھوں پر نیا کمبل ڈالے جب

سعید نے اپنی تسبیح کا آخری پھیرا مکمل کیا تو اس کے کمرے میں ایک عجیب طرح کا چاندنا ہو گیا..... سلیٹی رنگ کا تیز چاندنا۔ جیسے سورج گرہن لگنے پر دن کی روشنی جست کے رنگ کی ہو جاتی ہے اور سائے عجیب صورت کے ہو جاتے ہیں عین اسی طرح اس کا بند کمرہ خاکستری روشنی سے بقعہ نور ہو گیا۔ سامنے کی میز پر کتابوں کے انبار سے ڈھو لگائے ایک خوش پوش شخص اپنی گھڑی کو چابی دے رہا تھا اور اس کا چابی دینے کا انداز سعید سے ملتا جلتا تھا۔

سعید نے اُس اجنبی شخص کو غور سے دیکھا تو اُسے وضع قطع، رنگ روپ اور شکل و صورت کے اعتبار سے بہت ہی حسین پایا۔ اس کی نشست میں شہزادوں کی پھبن اور صوفیوں کی دل ربائی تھی۔ ایک موٹی ڈکشنری سے ٹیک لگائے وہ بڑی پرسنتا کے ساتھ بیٹھا تھا اور سعید کو دیکھ رہا تھا۔ ڈیڑھ پونے دو فٹ کا انسان، ایک طرفہ وجود، چاند نگر کا باسی، انوکھا لاڈلہ حزن و ملال سے پاک، مزے سے میز پر بیٹھا تھا۔ اس کے کندھوں اور گردن اور ٹھوڑی پر مسکراہٹ کی لہریں نمایاں تھیں لیکن اُس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ سعید نے ایک ہلکی سی کپکپی کے ساتھ پوچھا "تم کون ہو؟" تو اس نے ذرا سے توقف کے بعد بڑے سبھاؤ سے جواب دیا "میں سعید جونیئر ہوں اور تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ تمہارے وجود کا ایک حصہ اور تمہارے سریر کا ایک انگ ہوں۔ بلکہ میں تم ہی ہوں!"

سعید نے کہا "لیکن میں نے اس سے پہلے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

جونیئر نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے کہ اس سے پہلے کبھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی لیکن....."

"لیکن" سعید نے بات کاٹ کر کہا "کیوں نہیں ہوئی ملاقات؟ — کیا میں دستیاب نہیں تھا یا تمہاری دسترس سے باہر تھا؟"

"دونوں ہی باتیں نہیں تھیں۔ اور اس میں آپ کا کوئی بھی قصور نہیں ہے۔ دراصل میں ہی موجود نہیں تھا۔ میں Incubator میں تھا اور خلاف توقع مجھے کئی مہینے اس میں گزارنے پڑے۔"

"کیوں؟" سعید نے حیرانی سے پوچھا "تم Incubator میں کیوں تھے؟"

"اس لئے کہ میں ابھی خام تھا' نورسیدہ تھا' پری میچوئر تھا۔"

"لیکن اس وقت تو تم مجھ سے بھی زیادہ صحت مند اور خوبصورت ہو۔ اس وقت تو تم ایک دیوتا سے دکھائی دیتے ہو' آکاش سے اُترے ہوئے..... بھگوان سروپ!"

"اب میں میچوئر ہو چکا ہوں" سعید جونیئر نے کہا "اور میرے اندر ایسی پختگی پیدا ہو گئی کہ مجھ سے خوف اور ملال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے۔"

سعید نے اُس کی طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم میں ہوں تو پھر میں تم کیوں نہیں؟ میں تمہارے جیسا کیوں نہیں؟ میرے اندر تو خوف اور ملال بدستور موجود ہے بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

سعید جونیئر نے کہا "ذرا غور سے دیکھو......"

سعید نے کہا "دیکھ رہا ہوں اور بڑے غور سے دیکھ رہا ہوں..... بلکہ غور ہی سے دیکھ رہا ہوں —"

پھر وہ دونوں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ سعید نے کہا "اگر تم میں ہو تو پھر تم اس قدر خوبصورت کیوں ہو؟ میں تو اتنا خوبصورت نہیں ہوں۔" سعید جونیئر نے کہا "ویسے یہ ساری خوبصورتی تم ہی نے مجھے عطا کی ہے اور تم ہی اس کے خالق ہو۔ میں اپنے طور پر کچھ نہیں ہوں۔ میں تو بالکل پری میچوئر تھا۔ یہ سب تمہارا کرم ہے۔"

سعید نے کہا "مجھے محسوس تو ہوتا ہے..... بلکہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ تم میرے نقشے ہو لیکن تم تو بہت ہی حسین ہو۔ تمہارا ناک نقشہ تو غلمانوں جیسا ہے.... کیا تم واقعی غلمان ہو؟"

سعید جونیئر نے ہنس کر کہا "نہیں، میں غلمان نہیں ہوں۔ میں صرف اُن کا دوست ہوں۔"

"کیا تم نے حضرت یوسف کو دیکھا ہے؟" سعید نے اچانک پوچھا تو سعید جونیئر نے سر جھکا کر کہا" اُن کی خدمت میں تو اکثر حاضری رہتی ہے۔ وہ بہت ہی شفیق، بے حد کریم اور نہایت ہی رحم دل بادشاہ ہیں۔ میں نے اُن کی ملازمت بھی کی ہے اور

حضرت زکریا کے یہاں بھی حاضری دی ہے۔"

"لیکن میں تو چنگی کے محکمے کا ایک معمولی سا کارندہ ہوں اور تمہارا نقشہ ہو بہو مجھ سے ملتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"تم واقعی ٹھیک کہتے ہو۔ تم محکمہ چنگی کے ایک معمولی آفیسر ہو اور میرا نقشہ ہو بہو تم سے ملتا ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن تم تو بہت ہی خوبصورت ہو اور میں نے تم جیسی خوبصورت مخلوق نہ تو آج تک کسی تصویر میں دیکھی نہ خواب میں۔"

"تم درخت ہو اور میں تمہارا بون سائی ہوں اور تم جانتے ہو کہ بون سائی درخت یعنی اصل درخت سے بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اس لئے میں بھی خوبصورت ہوں۔"

"لیکن ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم ہو بہو میرا نقشہ ہو۔"

"جب آفسٹ کی چھپائی کرتے ہیں ناں سعید" سعید جونیئر نے اُسے بزرگوں کی طرح مخاطب کرتے ہوئے کہا "تو ڈیوڑھی لکھ کر اُسے ریڈیوس کر کے اس کی پلیٹ بناتے ہیں۔"

"کیوں؟" سعید نے پوچھا۔

"کتابت کی یا تصویر کی یا نقشے کی نوک پلک سنوارنے کے لئے، تصویر کے خدوخال اُجاگر کرنے کے لئے، طباعت میں حسن پیدا کرنے کے لئے — اسی طرح سے میں ہوں!"

"تم میری ڈیوڑھی تخفیف ہو؟" سعید نے حیرانی سے پوچھا تو سعید جونیئر نے ہنس کر کہا "پاگل بندے! میں تمہاری تین سو پچیس گنا تخفیف ہوں۔ تمہارے نقشے کی تین سو پچیس مرتبہ تقلیل کر کے میری پلیٹ بنائی گئی ہے۔"

سعید نے کہا "پھر تو ٹھیک ہے، پھر تو تمہیں اس قدر خوبصورت ہونا ہی تھا۔ یکن حیرانی کی بات ہے...." اس نے سوچتے ہوئے کہا "تم کو تین سو پچیس مرتبہ کیوں ریڈیوس کیا گیا؟"

"اس لئے کہ تم اپنے صبح و شام کا ورد تین سو پچیس مرتبہ روزانہ کیا کرتے

ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" سعید نے تڑپ کر پوچھا۔

سعید جونیئر نے دور بیٹھے بیٹھے چھبی سی دے کر کہا "اوئے پاگل بندے میں ہی تو تمہارا ورد ہوں — پہلے تو ایک مدت تک میں ان کیوبیٹر میں رہا لیکن جونہی میں میچوئر ہو کر وجود میں آیا تو تمہیں بھی دیکھنے آ گیا۔"

سعید نے منہ ہی منہ میں "شکریہ" کہنے کی کوشش کی مگر اس سے بولا نہ گیا۔

سعید جونیئر نے کہا "میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ آیا تھا لیکن اُس وقت تم سو رہے تھے۔"

سعید نے کہا "تم کبھی عرش معلٰی پر بھی گئے ہو؟"

"اور میرا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے بھلا!"

"پھر تو تم نے ذات بحت کی زیارت بھی کی ہو گی؟"

"وہ تو روز ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ جب یہاں ذکر ہوتا ہے تو وہاں بھی ذکر ہوتا ہے۔ ہم اس "ہوتے" کے درمیان ہوتے رہتے ہیں۔ ہم پر بڑا فضل ہے اور اس فضل کی سپاٹ لائٹ ہر وقت ہمارے گرد رہتی ہے۔"

سعید نے منہ پھاڑ کر چنگی سپرنڈنٹ کے گندے سے لہجے میں کہا "بڑی سرکار سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ورد وظیفے تو میں نے کئے اور ذکر اذکار کی تانت میں نے بجائی لیکن تعلق تم نے قائم کر لیا۔ دھنتر تم بن کر بیٹھ گئے! — میں نے اس لئے تو اتنی کڑی ریاضت نہیں کی تھی۔"

"تم نے یہ ساری ریاضت اور لمبی لمبی شب بیداری لاٹری کے ٹکٹوں کے لئے کی تھی" سعید جونیئر نے کہا "اور آنے والے سارے انعامی بانڈوں کے نمبر اُوپر کھلے پڑے ہیں۔"

"اُوپر کھلے پڑے ہیں!" سعید نے حسرت بھری آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

سعید جونیئر نے کہا "بالکل اس طرح جیسے یہاں دیواروں پر رنگ برنگ اشتہار لگے ہوئے ہیں اور سڑکوں پر بڑے بڑے ہورڈنگ ہوتے ہیں، پٹرول، ٹیرے کے خیمے

نمانوٹس سٹینڈ رکھے ہوتے ہیں۔"

"اور اُن پر انعامی بانڈوں کے نمبر لکھے ہوتے ہیں؟" سعید نے جلدی سے پوچھا "اگلی قرعہ اندازی کے صحیح نمبر؟ آنے والی قرعہ اندازی کے؟"

"بالکل" سعید جونیئر نے آہستگی سے کہا "آنے والے دس سالوں کی قرعہ اندازیوں کے صحیح نمبر — وہاں ہر معاملے میں دس دس کا حساب چلتا ہے..... مقدار میں، وزن میں، ناپ تول میں اور میعاد و استمرار میں۔"

"بڑے انعامی بانڈوں کے نمبر بھی؟" سعید نے جلدی سے پوچھا۔

"بالکل" سعید جونیئر نے اطمینان سے کہا "ایک ہزار، دس ہزار، پچیس ہزار..... ہمارے انعامی بانڈوں کے کھلنے والے صحیح نمبر..... جلی ہندسوں میں۔"

"اور صاف پڑے ہوتے ہیں، کھلم کھلا؟"

"بالکل صاف — کھلم کھلا"

"اور تم اُن کو نوٹ نہیں کرتے؟"

"ہمارا اُن سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا — ہم نے کبھی اُدھر توجہ بھی نہیں دی۔"

"وہاں تم جیسے اور بھی ورد وظیفے ہوتے ہیں؟"

"بے حساب، بے شمار، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں — دور دور کے علاقوں، ملکوں، براعظموں کے..... پوری کائنات کے۔"

"تم ان سب سے ملتے ہو؟ اُن کو پہچانتے ہو؟ اُن کو جانتے ہو؟"

"سب کو تو خیر ناممکن ہے لیکن میں میانوالی، کھلنا، چاٹگام، تیونس اور جکارتا کے بہت سے مشکل اوراد وظائف سے واقف ہوں جو اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے وہاں بہت ہی چاہے اور سراہے جاتے ہیں۔"

"کیا میں ایک مرتبہ بھی وہاں نہیں جا سکتا؟" سعید نے دُکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو سعید بھائی" سعید جونیئر نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا "اس کائنات کے جتنے بھی عبادت گزار اور شب زندہ دار انسان ہیں..... اگر وہ اپنے اخلاق،

افعال اور کردار میں تبدیلی نہ کریں تو وہ کسی مقام پر بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اللہ چونکہ کسی کے اعمال ضائع نہیں کرتا اس لئے اُن کے ورد و وظائف اور ذکر اذکار اللہ کے حضور میں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔"

"اور انسان اُسی مقام پر رہ جاتے ہیں..... اپنے اصلی اور سفلی مقام پر؟"

"اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے" سعید جونیئر نے مسکرا کر کہا "میرا منہ تو نہیں لیکن آپ اُسی جگہ پر بیٹھے ہیں لیکن آپ کا ذکر اُوپر پہنچ گیا ہے۔"

"اور میں یہیں بیٹھا رہوں گا' ساری عمر؟" سعید نے غصے سے پوچھا۔

"جب تک آپ کے اعمال درست نہیں ہوں گے اور آپ کی نیت ٹھیک نہیں ہو گی آپ کولہو کے بیل بنے رہیں گے۔"

"تم اپنی یہ فلسفے بازیاں اور روح نوازیاں رہنے دو۔" سعید نے تلخ لہجے میں کہا اور سعید جونیئر کی طرف اُنگلی اُٹھا کر بولا "تم مجھے انعامی بانڈوں کے نمبر لا کر دے سکتے ہو یا نہیں؟"

سعید جونیئر نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے سعید بھائی! آپ چھوٹے سے فائدے کے لئے اُس انعام کو کیوں رد کر رہے ہیں جو آپ پر ہونے والا ہے۔"

"مجھے ہونے والے انعام کی کوئی ضرورت نہیں۔" سعید نے گرج کر کہا "مجھے صرف اپنے چھوٹے سے فائدے سے غرض ہے۔ میں نے آج تک اُس کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے اور آئندہ بھی اُس فائدے کے لئے یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں — زندگی بھر' تمام عمر' اپنی موت کے دن تک۔"

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں سعید بھائی" سعید جونیئر نے بسورتے ہوئے کہا "اپنے حلقے میں میری بڑی عزت ہے۔ میں اپنے ہم چشموں کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا اور اُنہیں کس طرح سمجھاؤں گا کہ سعید بھائی کا یہ مطلب نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں — وہ اپنا رُخ بدلنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور جلد ہی ہم لوگوں کے درمیان آنے جانے لگیں گے۔"

لیکن سعید نے اُس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "تم میری بات ماننے پر تیار ہو کہ نہیں؟"

سعید جونیئر چپ رہا۔

کمرے میں لمحہ بھر کے لئے خاموشی رہی..... پھر سعید اپنی جگہ سے اُٹھا اور میز کے سامنے سعید جونیئر کے وجود پر جھک کر بولا "تم مجھے اچھی طرح سے جانتے ہو جونیئر کہ تم میرے ہی وجود کی تقلیل اور میری ہی رُوح کی تخفیف ہو۔ اگر تم نے میری حکم عدولی کی اور میری خواہش پوری کرنے سے انکار کیا تو میں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں تڑپا تڑپا کر اور ترسا ترسا کر ختم کر دوں گا — بولو تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

سعید جونیئر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "میں مجبور ہوں سعید بھائی، میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ میری ساخت آپ سے مختلف ہے گو میں ظاہرا آپ کی فوٹو کاپی، آپ کا مثنیٰ دکھائی دیتا ہوں۔"

سعید نے اپنے اکڑے ہوئے بازو اور تنی ہوئی اُنگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زور سے کہا "آؤٹ! آؤٹ یو راسکل — سلی فول — ایڈیئٹ۔ دفع ہو جاؤ ابھی، اسی وقت..... نہیں تو میں تمہیں فنا کر دوں گا۔"

سعید جونیئر بڑی آہستگی اور شرافت کے ساتھ میز سے اُترا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز سعید نے شہر کے تینوں بڑے اخباروں میں دو انچ ایک کالم کے اشتہار شائع کروائے کہ "میں نے بوجہ نافرمانی سعید جونیئر کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے اور اُسے اپنی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ سے عاق کر دیا ہے۔ اب اُس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ جو کوئی بھی اُس کے ساتھ کسی قسم کا لین دین کرے گا، وہ اپنے نفع و نقصان کا خود ذمہ دار ہو گا۔"

اشتہار چھپ جانے کے بعد سعید نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ سعید جونیئر کے دائرۂ اثر سے آزاد ہو گیا ہے اور اُسے اس بات کا خوف نہیں رہا کہ وہ جی بھر کے دنیا نہیں کما سکے گا۔ پھر اس نے اطمینان کی ایک انگڑائی لے کر کہا "دنیا کمانے کا تو ہمیں کھلا حکم ہے..... پوری چھٹی ہے..... مکمل آزادی ہے۔ یہ احمق تو مجھے اس راہ پر چلنے کو کہتا تھا جو ہم لوگوں کے لیے مخصوص ہی نہیں۔" پھر اس نے سر جھٹک کر کہا "کس قدر اوپر رہتا ہے پھر بھی دنیا کو کھیل تماشا اور متاع غرور سمجھتا ہے۔ کس قدر ذہنیت ہے!"

آخری حملہ

وہ دل اور پھیپھڑے کے درمیان ایک کھلی سی ورید میں کھڑا تھا اور غصے سے کانپ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ پیتھوجینک خان اپنے آپے سے باہر ہوا تھا بلکہ ایک ہفتے کے اندر اس پر تین مواقع اسی قسم کے گزرے تھے۔

جب باس کو، جنرل کو، صاحب خانہ کو یا بادشاہ وقت کو غصہ چڑھا ہو تو ماتحتوں کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ وہ زندہ تو رہتے ہیں اور اپنے فرائض منصبی بھی ٹھیک ٹھیک سرانجام دیتے ہیں لیکن اُن کے دل اندر سے بجھ جاتے ہیں اور اُن میں کام کرنے کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہتی جو آگے بڑھ کر غنیم پر حملہ آور ہوتی ہے اور دشمن کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔

پیتھوجینک خان کے سامنے چھوٹے بڑے رینک کے کئی آفیسر سر جھکائے کھڑے تھے اور اُنہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنے باس کے الزامات و اتہام کا کیا جواب دیں۔ تین دن پہلے بھی کچھ اس قسم کی پیشی ہوئی تھی لیکن پسلائی سپاہیوں کی ایک رجمنٹ کی یقین دہانی پر باس نے سب کو ڈیڑھ دن کی مہلت اور دے دی۔ لیکن اب پورے تین دن ہو گئے تھے اور راحیلہ اُسی طرح بستر پر لیٹی تھی۔ اس پر وہی پہلے دن کی شدت کا بخار تھا، نہ کم نہ زیادہ..... لیکن وہ بدستور زندہ تھی۔

اٹھارہ برس کی دھان پانی سی لڑکی..... بڑے بڑے کولہے، کشادہ کندھے، نامعلوم سا پیٹ، خوبصورت پاؤں، پیلی رنگت۔ پانچ روز سے ڈفتھیریا کے مرض میں مبتلا تھی اور ابھی تک زندہ تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی اور چوٹی کے جراثیم اُس کے اندر جمع تھے اور تین چوٹی کے ڈاکٹروں نے اُسے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ مریض کی حالت تشویش

ناک ہے، یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا اس لئے لواحقین کو ہمارے علاج کے ساتھ ساتھ دعا بھی کرانی چاہیے۔

راحیلہ جب بھی سوجے ہوئے گلے میں رکے ہوئے سانس سے زچ ہو کر آنکھیں کھولتی تو اپنی امی کو ساتھ کی کرسی پر پتھر کے بت کی طرح بیٹھے دیکھتی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی اور کہہ نہ سکتی۔ امی رونا چاہتیں اور رو نہ سکتیں۔ دونوں ہی مجبور تھیں۔ دونوں کی آس ڈوب چکی تھی۔ اور دونوں سمجھ چکی تھیں کہ کیا ہونے والا ہے!

راحیلہ کے اندر چھوٹے بڑے بیکٹیریا اپنی بساط سے بڑھ کر سمیات چھوڑنے پر لگے ہوئے تھے اور خوف سے کانپ رہے تھے کہ وہائٹ بلڈ سیلز چنگیز خانی فوجوں کی طرح ان پر ٹوٹ کے حملے کر رہے تھے۔ اُن کے ایک ہی ہلے میں بڑے بڑے اعلیٰ نسل کے جی دار جراثیم داد شجاعت دیتے ہوئے لقمہ اجل بن رہے تھے۔ مرنے والوں کے خاندان اور قریبی رشتہ دار نالہ و شیون کرتے ہوئے قریبی شریانوں میں گھس کر فریاد کر رہے تھے لیکن خون کے سفید خلیوں کا پلہ بہت ہی بھاری رہا۔

پیتھوجینک خان نے چنگھاڑ کر پسلائی کے حاضر گروہ سے پوچھا "تمہارے ہتھیار کدھر ہیں؟"

اُنہوں نے رو کر کہا "سر! کل رات ڈاکٹروں نے ہیوی ڈوز کی بھرمار کر دی۔ ہم دن بھر کے تھکے ہارے، شامت کے مارے ابھی ذرا سی ڈھو لگا کر ستانے ہی لگے تھے کہ اینٹی بائیوٹک دواؤں نے ہمارے اُوپر شبخون مار کر اندر سموک سکرین پیدا کر دی ور سکرین کے پردے میں ہمارے ہتھیار اُٹھا کر اُنہیں آن واحد میں ڈزالو کر دیا۔ ہمارے تقریباً پچاس لاکھ جراثیم اس ایک جھڑپ میں ملیامیٹ ہو گئے۔"

"بکواس کرتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔" پیتھوجینک خان نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا" مجھے احمق بناتے ہو۔ اُلّو کا پٹھا سمجھتے ہو۔ میں نے گیارہ قسم کی اینٹی بائیوٹکس کا مقابلہ کیا ہے۔ ہر مرتبہ اپنی جان پر کھیل کر اُن سے لڑا ہوں اور خدا کے فضل سے کامیاب ہوا ہوں۔ کیا میں اینٹی بائیوٹکس کے مزے، اُن کی خوشبو، اُن کے رنگ اور اُن کی کارکردگی سے واقف نہیں ہوں! تم جھوٹ بولتے ہو اور مجھے احمق سمجھتے ہو!"

ایک لاکھی جراثیم آفیسر نے جس کے دائیں بائیں دس ہزاری پیادہ جراثیموں کے دوپرے کا بریگیڈ کھڑا تھا، بڑے ادب کے ساتھ چھوٹی کھرج میں کہا "سر وہ کوئی نئی قسم کی اینٹی بائیوٹک تھی۔ اس نے معدے میں اُترتے ہی ایلکا سیلزر کی طرح بلبلے سے چھوڑے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے محاذوں پر دھوئیں کے بادل چھا گئے۔"

پیتھوجینک خان نے آفیسر کے کندھے سے اس کے نشان نوچتے ہوئے کہا "بریگیڈیئر تم سمجھتے ہو میں بچہ ہوں۔ رموز جنگ سے ناآشنا ایک بازاری چھوکرا ہوں! تمہارا خیال ہے میرے پاس اس اچانک حملے کی خفیہ تفصیل نہیں..... اس جھڑپ کی انٹیلی جنس رپورٹ نہیں۔ میں پاگل ہوں!؟"

بریگیڈیئر نے شرمندگی سے مسکرا کر کہا "کیوں نہیں سر، کیوں نہیں۔ آپ کو تو ایک ایک چیز کا علم ہوتا ہے۔ واقع گزرنے سے پہلے اس کی ساری تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔"

مارشل پیتھوجینک خان نے سنجیدگی سے کہا "وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اینٹی بائیوٹک نہ اس کا دھواں، نہ کوئی سموک سکرین نہ شب خون۔ تم ایک خوف زدہ اور ڈرپوک قوم کے ڈرپوک سپاہی ہو اور تم میں اس ہزیمت خوردہ قوم کی ساری قباحتیں اور نحوستیں پیدا ہو چکی ہیں جو کئی صدیوں تک دوسروں کی غلام رہ چکی ہوتی ہے — سنو! وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ پنسلین 500 کی دو گولیاں تھیں جو معدے میں اُتریں اور تمہاری صفوں میں خوف کا بھونچال آ گیا۔"

مارشل نے اس کے دوسرے کندھے کا پھول بھی نوچا اور چیخ کر کہا "بی آف یو بلڈی — میں تمہاری شکل دیکھنی نہیں چاہتا۔ تم سے ایک نحیف و نزار سی لڑکی نہیں ماری جا سکی..... تم کسی صحت مند، ہٹے کٹے اور مضبوط جسم کو کیسے فنا کرو گے!"

بریگیڈیئر اپنے پھول نچنے کے ساتھ ہی خاموش ہو گیا تو اس کے کرنل نے کہا "سر ہم اتنے بزدل بھی نہیں ہیں جس قدر آپ سمجھ رہے ہیں۔ دراصل ہم کو کئی محاذوں پر ایک ساتھ لڑنا پڑ رہا ہے اور ہمارے ذرائع بڑے محدود ہیں۔"

کرنل کی یہ بات سن کر مارشل پیتھوجینک غصے سے پھنکارا اور اس نے چلا کر کہا "کون سے کئی محاذ" ہیں جن پر تم داد شجاعت دے رہے ہو اور تمہارے وہ کون

سے ذرائع ہیں جو محدود ہو گئے ہیں اور ہماری بے خبری کی وجہ سے محدود ہو گئے ہیں؟"

کرنل نے کہا "دیکھنے کو یہ ایک دھان پان سی روماٹیک لڑکی نظر آتی ہے مگر اس کے اندر خون کے سفید خلئے پیدا ہونے کی فیکٹریاں لگی ہیں۔ ہم جہاں بھی اپنا پیادہ جراثیم فوج کے ساتھ حملہ کرتے ہیں خون کے سفید خلئے لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں ہمارے سپاہیوں کو گھیر لیتے ہیں اور انہیں تیزی سے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ہمارے تجربہ کار، بہادر اور سورما سپاہیوں کو پکڑ کر اس بے دردی سے چباتے ہیں کہ اُن کے تیزی سے چلتے ہوئے جبڑوں کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔"

مارشل پیتھوجینک خان نے اس کی بات کو سنجیدگی سے سنا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ کرنل نے حوصلہ پا کر ذرا سا آگے جھک کر کہا "سر! آپ یقین نہیں کریں گے، جب خون کے سفید خلئے ہمارے سپاہیوں کو مکئی کے دانوں کی طرح چبا رہے تھے تو راحیلہ کا منگیتر اس کے بازو سہلاتے ہوئے اور بار بار اُس کے ہاتھ چومتے ہوئے پوچھ رہا تھا..... یہ تمہارے اندر کٹر کٹر کی آواز کیسی آ رہی ہے؟ لیکن جب راحیلہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اس نے اپنا کان راحیلہ کے پیٹ سے لگا کر غور سے سنا تو اندر ہماری فوجوں پر فنا کا عمل جاری تھا۔"

مارشل نے کہا "تمہارے خیال میں اس بربادی اور ایسی تیز ہلاکت کا کون ذمہ دار ہے؟"

"ہم ذمہ دار ہیں سر، ہم ہیں۔ لیکن ہم بھی مجبور ہیں کہ ہمارے پاس سامان حرب کی کمی اور فنڈز کی قلت ہے۔"

کرنل کا یہ جواب سن کر مارشل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تلملا کر بولا "اگر اب بھی تمہارے پاس فنڈز کی کمی ہے تو لعنت ہو ہم پر جو فنڈز فراہم کرتے ہیں اور پھٹکار ہو تم پر جو فنڈز میں خرد برد کرتے ہو۔"

کرنل نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور دُکھ بھرے لہجے میں بولا "آپ کو اچھی طرح سے معلوم ہے سر کہ فنڈز میں گھپلا کہاں ہوتا ہے اور کون لوگ اس میں ملوث ہیں۔ ہم بد نصیب تو خواہ مخواہ پٹتے ہیں اور مفت میں جھڑکیاں سہتے ہیں.... اگر ہم کو یہ

معلوم ہوتا کہ ـــ"

لیکن مارشل نے کرنل کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور سوچتے ہوئے بولا "اگر تم لوگوں کو کچھ اور فنڈز نئے سرے سے فراہم کر دیئے جائیں اور فوراً کر دیئے جائیں تو پھر تم ایک نیا حملہ کرنے میں اور کتنی دیر لگاؤ گے؟"

"جتنی دیر میں ایک نیا نقشہ تیار ہوتا ہے سر، بس اتنی دیر ـــ نفری تو ہمارے پاس کافی ہے۔ اور جوان بھی بڑے جی دار ہیں... لیکن...."

"ابھی تو تم اپنے جوانوں کی بے پناہ ہلاکت کا ذکر کر رہے تھے" مارشل نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اور اب کہہ رہے ہو کہ ہمارے پاس کافی نفری موجود ہے۔"

"وہ سر بات یہ ہے" کرنل نے سرگوشی میں کہا "راحیلہ کی باڈی میں کچھ دستے ٹائیفائیڈ کے جراثیموں کے گئے اور سالمونیلاٹائی فی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔"

"یہ کدھر سے آ گئے؟" مارشل پیتھوجینک نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ سب اس کا کرم ہے سر" کرنل نے خوش دلی سے کہا "جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دوسرا خودبخود کھل جاتا ہے۔ میں اس کی کوئی وجہ نہیں بیان کر سکتا سر لیکن شاید اس کی ماں نے اُسے وہی دودھ پلانے کی کوشش کی ہو جو کل کا فریج میں پڑا تھا۔"

"خوب خوب!!" مارشل نے اپنے کرنل کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا "اُن کو ساتھ ملاؤ۔ اُن سے کام لو اور اُن کو خوش کرو۔ میں تمہارے لئے خصوصی فنڈز کا ابھی انتظام کرتا ہوں۔"

کرنل نے ایڑی ملا کر اور پنجے کھول کر ہاتھ کے ایک جھٹکے سے مارشل کو سلیوٹ کیا اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مارشل پیتھوجینک گردوں اور کلیجی کا ایک سرسری سا معائنہ کرنے کے بعد تلی کے تفصیلی جائزے کے لئے تلی کی سرحد پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک افراتفری اور نفسانفسی کا عالم تھا۔ راحیلہ کے بدن کے گوشے گوشے سے دھڑا دھڑ جنازے آ رہے تھے اور تلی کا قبرستان نئی قبروں سے لبالب بھر گیا تھا۔ بدن کے خلیوں کی اندھا دھند ہلاکت سے

محدود گورکنوں کی جانیں عذاب میں پڑ گئی تھیں اور اُنھوں نے ایک ایک قبر میں سینکڑوں خلیوں کو ایک ساتھ دفن کرنا شروع کر دیا تھا۔ مارشل نے اپنی ٹوپی کا چھجا اُوپر اُٹھا کر دور دور تک دیکھا اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ تلی کے سارے قبرستان بڑی بڑی اجتماعی قبروں سے پٹ گئے ہیں اور اب وہاں مردے دفنانے کی مزید گنجائش باقی نہیں رہی۔ اب ضرورت بدنی کے تحت بڑی آنت اور چھوٹی آنت کے مختلف راستوں میں نئے قبرستانوں کی گنجائش نکالی جاری ہے اور آنتوں کے راستے بھی چھوٹی بڑی قبروں سے معمور ہو گئے ہیں۔

خلیوں کے بڑھتے ہوئے قبرستانوں سے خوش ہو کر مارشل نے راحیلہ کے دونوں گردوں کا معائنہ کیا۔ اس فرنٹ پر اس کے جوان بڑی دلیری سے لڑ رہے تھے اور ڈیفنس کے ناکے توڑ رہے تھے۔ یہاں اس نے سپلائی کے دونوں ڈپوؤں سے دریافت کیا کہ اُنہیں مزید فنڈز کی کس قدر ضرورت ہے تو پتہ چلا کہ وہ پرانے سٹاک سے ہی کام چلا رہے ہیں اور راحیلہ کے ختم ہونے تک اس سے کام چلاتے رہیں گے۔

مارشل نے کہا "لیکن اب تک تو راحیلہ کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟" تو ایک موٹے پیٹ والے صوبیدار میجر نے کہا "سر جب تک گلے کے اندر کی نفری جان پر کھیل کر نہیں لڑے گی اور فریش ٹاکسن تیار کر کے لیتھل ہتھیاروں سے دل پر حملہ نہیں کرے گی اس وقت تک ہم کامیاب نہیں ہوں گے۔ ڈفتھیریا میں سر جب تک گلے کے اندر بننے والا زہر ڈائرکٹ دل میں اور دل کی شریانوں میں نہیں اُترتا اس وقت تک دشمن فال نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں سر کہ راحیلہ کے گلے کے اندر کا فرنٹ کافی کمزور ہے اور اس میں ہم مار کھا رہے ہیں۔"

مارشل پیتھوجینک صوبیدار میجر کی بات پر غور کرتا ہوا وہاں سے دل کی جانب روانہ ہوا تو راستے میں اُسے خیال آیا کہ وہ اس وار پلان کے جنرل مائیکروب سے تو ملا ہی نہیں۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنی سواری کا رُخ شہ رگ کی طرف پھیر دیا۔ یہاں جنرل مائیکروب کا ہیڈ کوارٹر تھا اور دور دور تک اس کے سٹاف کے تنبو لگے تھے۔

جب مارشل اس ایریا کمانڈ کے اندر داخل ہوا تو ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ جوانوں کی چھوٹی بڑی ٹکڑیاں قطاروں میں سج کر چاق و بند دستوں میں منقسم ہو

گئیں۔ ہر طرف سلیوٹ کے کاشن ملنے لگے۔ اور مارشل مارچ پاسٹ کا معائنہ کرتے ہوئے جنرل کی چھولداری میں پہنچ گئے — لیکن جنرل وہاں موجود نہیں تھا اور چھولداری خالی پڑی تھی۔

مارشل نے گرج کر جنرل کی ناموجودگی کی وجہ دریافت کی تو کونے میں چائے کا مگ گرم کرتے ہوئے بیٹ مین نے کانپتے ہوئے کہا "سر! وہ چھوٹی شہ رگ سے ہو کر ابھی اُوپر دماغ میں گئے ہیں، وہاں ہماری نفری فال کر گئی ہے۔"

مارشل پیتھوجینک بڑی شاہ رگ میں سے اُوپر چڑھ کر دماغ کی سرحد پر پہنچے تو وہاں بینائی کی نرو کے پاس جنرل مائیکروب دشمن کے سپاہیوں کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے اور کسی گہرے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ مارشل نے ذرا سا ٹھٹک کر اُنہیں غور سے دیکھا اور پھر اُن کے قدم وہیں جم گئے۔

اُن سب کے درمیان کسی پیچیدہ مسئلے پر گرما گرم بحث جاری تھی اور وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بات کی باریکیوں کی داد دے رہے تھے۔ مسئلہ کچھ غور طلب معلوم ہوتا تھا کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بات کرنے کے باوصف وہ سنجیدگی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور نگاہیں جما کر ایک دوسرے کی بات سن رہے تھے۔

مارشل غصے سے بھرا ہوا آگے بڑھا تو جنرل نے ہاتھ اُٹھا کر اپنی ٹوپی کے کنارے کو اُنگلیوں سے چھوا اور مسکرا کر مارشل پیتھوجینک کو خوش آمدید کہا۔ خون کے سفید خلیوں کا تعارف جنرل نے مارشل سے کرایا تو مارشل کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ اس نے اپنے جنرل کے نئے ساتھیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا "یہ سب کیا ہو رہا ہے جنرل اور یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم محاذ جنگ پر دشمنوں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہو؟ یہ کس عزم کی پاس داری اور کس رویے کی ترجمانی ہے جو تم اُن کے اس قدر قریب آ گئے ہو؟"

جنرل نے مسکرا کر کہا "سر! جب سے ہم نے راحیلہ پر حملہ کیا ہے اور جس روز سے اس کے اندر ہمارا محاذِ جنگ کھلا ہے، میں راحیلہ کے کمرے کی چیزوں کو بڑے ..ر سے دیکھ رہا ہوں اور اُنہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آج تیسرا دن ہے سر اور میں ابھی تک رنگین ٹیلی ویژن کی ورکنگ کو نہیں سمجھ سکا۔ بھلا کسی دوسرے مقام کی

تصویر بغیر کسی کنکشن کے کس طرح اس ٹی وی سیٹ میں پہنچ سکتی ہے..... جو وہ بھی رنگین اور اپنے سارے رنگوں کی جزئیات کے ساتھ؟"

مارشل نے گھور کر جنرل مائیکروب کو دیکھا تو اُس نے کہا "سر اس کے ساتھ ہی ایک فیکس مشین رکھی ہے جو سات سمندر پار کے کاغذ کا چربہ یہاں، اس کمرے میں اُتار کے رکھ دیتی ہے..... ہو بہو نقشہ، پوری تفصیلات، نقل مطابق اصل۔ میں تو حیران ہوں سر کہ ایسا کس طرح سے ہوتا ہے! میں اس کا راز جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور تین دن سے سر مار رہا ہوں لیکن مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آتا..... کچھ بھی پکڑائی نہیں دیتا۔"

مارشل پیتھوجینک نے جنرل کے رینک کا خیال رکھے بغیر چیخ کر کہا "اوے احمق، بدھو، نالائق کسی علاقے کے! کس خیال کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ ذات کے جراثیم، نسل کے مائیکروب، خردبین کے بغیر معدوم الذات اور چلے ہو ٹیلی ویژن کی ورکنگ سمجھنے..... فیکس مشین کا اندر پیٹا معلوم کرنے! تم سا بے حیا ذی رُوح میں نے اپنی ساری سروس میں نہیں دیکھا۔ کبھی اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟"

جنرل نے خفیف ہو کر سر جھکا لیا اور شرمندگی سے بولا "سر! انسان بھی تو خدا کی ذات اور اس کی کنہ معلوم کرنے میں کب سے لگا ہوا ہے حالانکہ اس کا وجود خدا کے مقابلے میں ہم جراثیموں سے بھی کئی ارب بلکہ کھرب گنا چھوٹا ہے..... بلکہ کوئی وجود ہے ہی نہیں۔"

"تو پھر اُن کو کیا ملا؟" مارشل نے پوچھا "باتیں! مکالمے!! گفتگو!!! کیا تم بھی انہی کی طرح ہو کر رہنا چاہتے ہو؟ — اُٹھو! اپنا جنگی نقشہ نکالو اور اپنے پلان کے مطابق پھر سے کام شروع کرو۔ تم کو کیا لینا ہے رنگ دار ٹی وی سے اور اس کی ورکنگ سے؟"

ابھی مارشل یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اردگرد کھڑے ہوئے خون کے سفید خلیے اُن پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے کڑچ کڑچ کر کے اُن کو نگل گئے۔

راحیلہ نے اپنے منگیتر کا بھاری بھرکم سر دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھا کر کہا "بس کرو بہانے باز اور اُٹھاؤ اپنا یہ ہنڈا سا سر میرے سینے سے..... اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی اور نہ ہی کوئی کسی کی ہڈیاں چبا رہا ہے۔ اس وقت تو تم ہی میری پسلیاں توڑ رہے ہو۔ اُٹھاؤ اس بھرکم تودے کو!"

کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ

رات کے نو ساڑھے نو بجے میں اپنی پرانی سائیکل پر سوار ملتان روڈ کی متوازی سڑک پر لاہور کی جانب آ رہا تھا۔ یہ سردیوں کی رات تھی لیکن ابھی بہت سے لوگ سڑکوں، راستوں اور پگڈنڈیوں پر موجود تھے۔ کوئی سڑک سے اُتر کر پیچھے کھیتوں کی جانب جا رہا تھا، کوئی کھیتوں سے اُوپر سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ میرا رُخ لاہور کی طرف تھا اور پانی سے لبالب بھری ہوئی نہر میرے بائیں ہاتھ میری مخالف سمت جا رہی تھی۔

اچانک مجھے محلے داروں کے باغ کے پاس ایک بہت بڑا انجن نظر آیا۔ اس انجن کی تین بتیاں روشن تھیں اور دو بجھی ہوئی تھیں۔ انجن والے بھائی نے تالی بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میں سائیکل سے اُتر کر پلیا پر ہو لیا اور ڈرائیور کے قریب پہنچ گیا۔

وہ کرہ ارض کا ڈرائیور نہیں تھا، کسی اور منطقے کا گاڑی چلانے والا تھا۔ جب میں نے غور سے انجن کی طرف دیکھا تو وہ انجن نہیں تھا بلکہ پرانی طرز کی ایک اُڑن طشتری تھی جس کے بارے میں میں نے اپنے لڑکپن میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اُڑن طشتری تھی تو پرانی لیکن کسی نے بڑی سنبھال کے رکھی تھی۔ ابھی تک اس کا اپنا اوریجنل پینٹ تھا اور اُوپر کی ٹربائن بالکل خاموشی سے گھوم رہی تھی۔

ڈرائیور نے مجھے ایک تار دکھا کر اشارے سے سمجھایا کہ جونہی اس کی قریبی سبز بتی جلے، میں تار کو زور سے کھینچ مار کر پیچھے کو بھاگ جاؤں اور آم کے اس بڑے درخت کے پیچھے چھپ جاؤں۔

مجھے چونکہ رفاہ عامہ کے کاموں سے گہری دلچسپی ہے اور میں پردیسیوں کی مدد

کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں اس لئے میں نے اپنی سائیکل بڑے آم کے تنے سے لگا دی اور خود آستین چڑھا کر تار کھینچنے پہ تیار ہو گیا۔

ڈرائیور اُڑن طشتری کے اندر اپنی سیٹ پہ اتر چکا تھا اور اس نے ٹربائن کی سپیڈ بہت ہی تیز کر دی تھی۔ تار چونکہ بہت ہی چکنی دھات کی تھی اس لئے میں نے اُسے اپنی کلائی کے گرد ایک چکر دے کر لپیٹ لیا اور بتی پہ نگاہیں گاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ تار ٹھنڈی ہو رہی ہو اور اس سے برف کی دھند بر آمد ہونے لگی ہو۔

اچانک سبز بتی جلی..... چھوٹی سی تیز بتی! میں نے تار کو پوری طاقت کے ساتھ جھٹکا دیا اور اُڑن طشتری نے بھک کے ساتھ ایک زقند بھری۔ اس زقند کے ساتھ ہی اس کے پیٹ کے ایک کنارے پہ دو بڑے بڑے لاکر سے کھلے اور اُن میں سے ایک نے سڑکا مار کر مجھے اپنے اندر کھینچ لیا۔ لاکر کے اندر میرا سر زور سے اس کی چھت سے ٹکرایا جہاں فوم کی موٹی کشننگ کی ہوئی تھی اور جہاں سے میوزک قسم کی کوئی آواز آ رہی تھی۔

لاکر میں بیٹھنے کی کوئی باقاعدہ جگہ تو نہیں تھی البتہ یہاں پاؤں پھنسانے کے لئے رکابوں جیسے دو اڈے سے بنے ہوئے تھے۔ میں نے اُن میں اپنی ایڑیاں پھنسا کر سوچنا شروع کیا کہ گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ اطلاع دینے کی کوئی صورت نہیں تھی اور میں یہاں سے نکل کر کہیں اور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اُڑن طشتری کی ڈیزائننگ بہت ہی بھلی لگی لیکن یہ چونکہ ایک بہت ہی پرانا ماڈل تھا اس لئے اس میں اور بھی کئی خامیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔

کوئی آدھا راستہ طے کرنے کے بعد یہ اُڑن طشتری پھر خراب ہو گئی اور جس طرح بھک کر کے چلی تھی اسی طرح بھک بھک کر کے پھر رک گئی۔

ڈرائیور نے مجھے لاکر میں بیٹھے دیکھ کر مجھ سے کچھ پوچھا لیکن اس کی بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ وہ پرانی وضع کا ایک خوش طبع سا ڈرائیور تھا لیکن کمپنی کے رولز کے مطابق اُسے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اپنی بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں اب کیا کروں؟" تو اُس نے ایک تسلی

آمیز اشارہ کیا اور مجھے اُڑن طشتری سے باہر لے آیا۔ قریب ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور کوئی دوسری قسم کی مخلوق تھی جو اس منطقے کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس میں کچھ کچھ ہمارے جیسی خوبو تھی اور وہ بہت بے تکلف قسم کا ڈرائیور تھا۔

اس نے اندر بیٹھتے ہی تیز رفتاری کے ساتھ گفتگو شروع کر دی اور بار بار پیچھے مڑ کر واو طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی زبان کچھ عجیب سی تھی..... اُردو، پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی، براہوئی، شناء کھوار، بلتی، ہنزاکٹ، کلاش، بروشسکی، فنڈے، پوٹھوہار اور ہندکو کا کھچڑ سی تھی۔ مجھے اس کے بہت سے الفاظ آسانی کے ساتھ سمجھ آ رہے تھے اور جب میں آگے جھک کر زیادہ غور کرتا تھا تو مجھے اس کے نخرے بھی سمجھ میں آنے لگتے تھے۔

میں نے کہا "اس وقت ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

اُس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا "اس وقت ہم چھوٹی کہکشاں کے اُوپر جا رہے ہیں اور ہماری دائیں جانب خوف ناک کوارکوں کی وادی ہے۔ کوئی شخص رات کے وقت حیوانی کہکشاں سے نہیں گزرتا۔ سبھی ڈرتے ہیں، سوائے اس حقیر فقیر کے۔"

جب وہ بولتا تھا تو الفاظ اس کے منہ سے خبروں سے پہلے کے ٹائم سگنل کی طرح آواز دیتے تھے اور پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک کوک سی سنائی دیتی تھی۔ اس نے میری طرف گردن گھما کر پوچھا "آپ کہاں جائیں گے؟" تو میں نے سر ہلا کر کہا" مجھے کیا معلوم! میں تو پٹواری ضابطے خان سے مل کر آ رہا تھا کہ اس نے اپنی اُڑن طشتری کو مجھ سے دھکا لگوایا اور میں کھنچ کر ساتھ ہی آ گیا۔"

"کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟" اس نے بڑی ہمدردی سے پوچھا تو میں نے جھوٹ موٹ اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا کہ "ذرا سی کہنی چھل گئی تھی اور اس کے ساتھ دائیں گھٹنے پر چوٹ آئی تھی۔ سر بھی چھت کے ساتھ ٹکرایا تھا لیکن اس کی مجھے چنداں پرواہ نہیں۔ جو وقت بھی گزر رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔"

پھر اس نے اچانک بریکیں لگا کر ایک زور کی سکریچ ماری اور راستہ بدل لیا۔ میں سیٹ سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "شکر ہے ہم بچ گئے ورنہ ابھی مارے جاتا تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

اس نے پیچھے کو اشارہ کر کے کہا "چھوٹی کہکشاں کے خاتمے پر دو بلیک ہول کھڑے ہیں..... بد نسل قسم کے بلیک ہول جو ہر چھوٹی بڑی گاڑی کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ میں نے جب ایک بڈھے ستارے کو اُن کے منہ میں اُترتے دیکھا تو میرے تو پاؤں تلے کا زمانہ نکل گیا۔ میں نے فوراً گاڑی کاٹی۔"

میں نے کہا "کوئی ان بلیک ہولوں کو منع نہیں کرتا..... اُن پر پابندی نہیں لگاتا؟"

"کوئی نہیں لگاتا جی اُن پر پابندی۔" اس نے دکھی ہو کر کہا "اب وہ پہلے والا زمانہ نہیں رہا کھلی کائنات کا، اب یہاں بھی گھپلے بازی ہونے لگی ہے۔"

میں نے کہا "اور یہاں کی انتظامیہ، کرہ فضائیہ کی..... وہ؟"

"سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔" اس نے رنجیدہ ہو کر کہا "پہلے وقتوں میں جب دو ستارے ٹکرا جاتے تھے تو مہینہ مہینہ بھر ستاروں میں روشنی نہیں رہتی تھی۔ کسی کے ہاں چراغ تک نہیں جلتا تھا لیکن اب کہکشائیں ٹکرا جاتی ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔" پھر اس نے میری طرف چہرہ گھمائے بغیر کہا "آپ کے وہاں کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "ہمارے یہاں بلیک ہول تو نہیں ہوتے البتہ مین ہول ضرور ہوتے ہیں جو بلیک ہولوں کی طرح منہ کھولے انسانوں کو نگلتے رہتے ہیں۔"

میری یہ بات سن کر وہ بہت حیران ہوا اور بڑی دیر تک چپ چاپ ٹیکسی چلاتا رہا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں یا یہ مجھے کدھر لے جا رہا ہے..... جس طرح لیڈروں کے پیچھے اُن کے عوام چپ چاپ چلتے رہتے ہیں اور اُن کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور ان کے لیڈروں کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے عوام کو کدھر لے جا رہے ہیں، ایسی ہی کچھ میری کیفیت تھی۔

اس نے ونڈ سکرین پر نگاہیں گاڑے گاڑے مجھ سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں کہانیاں لکھتا ہوں۔"

اس نے کہا "اپنی کوئی کہانی مجھے بھی سناؤ۔"

میں کافی دیر تک سوچتا رہا لیکن میری کوئی کہانی ایسی اچھی نہ تھی جو اس کو سنائی جا سکتی تھی۔ جو کچھ اچھی تھیں تو وہ بہت لمبی تھیں اور اب مجھے ان کا تسلسل بھی یاد نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنی پسندیدہ کہانی سنانا شروع کر دی جو اصل میں میری نہ تھی بلکہ میرے دوست اے حمید کی تھی۔ اس کہانی میں ناریل کے درختوں، چائے کے ساواروں، سمندر کی لہروں اور جنگل سے اٹھنے والی پھواروں کا ذکر تھا جن کے درمیان سنتھالی عورتیں گاتیاں باندھے ایک دوسری کو آوازیں دیتی ہوئی گھوم رہی تھیں۔

اس نے گاڑی روک کر کہا "مجھے دکھاؤ، مجھے دکھاؤ۔"

میں نے کہا "کیا دکھاؤں؟" تو اس نے کہا "وہی سب کچھ جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے۔"

میں نے ہنس کر دکھ بھرے لہجے میں کہا "یہ سب کچھ میں تمہیں کیسے دکھاؤں۔ یہ علاقہ تو زمین پر ہے اور یہ لوگ وہیں رہتے ہیں۔"

زمین کا نام سن کر وہ ذرا اداس سا ہو گیا اور غم ناک لہجے میں بولا "زمین! — کہاں ہے یہ زمین؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ہم اسی طرح سے چلتے رہے۔

کہکشاں کے آخری سرے سے گزرتے ہوئے میں نے چلا کر کہا "روکو روکو..... زمین آ گئی، زمین آ گئی۔" اس نے احمقوں کی طرح میری جانب دیکھا تو میں نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا "روکو روکو۔ یہی تو زمین ہے۔ یہی تو زمین ہے۔"

اس نے زور کی بریکیں لگائیں تو ہماری ٹیکسی رکتے رکتے جاپان، آسٹریلیا، انڈونیشیا، ملائشیا سے گزرتی ہوئی اوکاڑے کے بازار میں جا رکی۔

آدھی رات کا عمل ہو گا۔ دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ کوئی کوئی کھوکھا کھلا تھا۔ ایک ریڑھی والا گیس کی بتی جلا کر ابھی تک گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ دودھ دہی کی دوکان کے آگے چند منہ زور لڑکے چہل بازیاں کر رہے تھے۔ ان کی حرکتیں تھوڑی تھوڑی فحش سی تھیں لیکن اوکاڑے جیسے مقام پر آدھی رات کے وقت کون دیکھتا تھا!

جب میں ٹیکسی سے باہر نکلا اور ٹیکسی والے نے اپنی سیٹ سے برآمد ہو کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا تو میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ فحش حرکتیں کرنے والے لڑکے اپنی حرکتیں چھوڑ کر ہم کو غور سے دیکھنے لگے۔ بابا دوکاندار جو گرم گرم دودھ سے بھری کنالیوں میں جاگ لگا رہا تھا، اپنا پھینٹی کرنے والا ڈبہ روک کر ہمیں دیکھنے لگا۔

مجھے اور ٹیکسی والے کو ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنے میں تھوڑی سی دیر لگ گئی۔ اتنے میں وہ لڑکے ہمارے قریب آ گئے لیکن ٹیکسی والا اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا ہوا ہو گیا اور اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں کہاں ہوں..... کون ہوں..... اور ابھی کس کے ساتھ تھا!

ان لڑکوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر پوچھا "آپ اشفاق صاحب ہیں؟" میں نے کہا "ہاں، تم نے ٹھیک پہچانا۔" پھر دوسرے نے پوچھا "یہ ٹیکسی والا کون تھا؟ ـــــ یہ تو کوئی عجیب سی مخلوق تھی۔ آپ کو کہاں سے ملی؟"

پیشتر اس کے کہ میں اس کی بات کا کوئی جواب دیتا، اس کے ایک لمبے تڑنگے ساتھی نے کہا "اوئے تم نے پہچانا نہیں، یہ باقر علی عرضی نویس کا بیٹا تھا جو دس بارہ سال ہوئے گھر سے دوبئی جانے کے لیے بھاگ گیا تھا۔ سیدھا سادا معصوم نوجوان تھا۔ نوسربازوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے دھوکے سے گوادر لا کر ایک پرانی وضع کی اگن بوٹ میں بٹھا کر چھوڑ دیا اور خود بھاگ گئے۔"

پہلے والے لڑکے نے کہا "میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، ہمارے ساتھ فلاش کھیلتا رہا ہے اور ہمیشہ ہارتا رہا ہے۔ شین کے بجائے سین بولتا تھا۔ شکر کو سکر اور شاباش کو ساباس کہا کرتا تھا۔"

پھر انہوں نے یک زبان ہو کر پوچھا "آپ کو کہاں مل گیا؟"

"ٹیکسی سٹینڈ پر!"

"کون سے ٹیکسی سٹینڈ پر؟"

"چھوٹی کہکشاں کے ٹیکسی سٹینڈ پر۔"

وہ حیرانی سے میرا منہ تکنے لگے اور تھوڑی دیر تک اسی طرح سے کھڑے

رہے۔ پھر اُن میں سے ایک بولا "اوئے یہ اشفاق صاحب تو نہیں' یہ تو کوئی اور ہی ہے۔ وہ تو دغ دغ کرتا لال سرخ سا انسان تھا۔ یہ تو خوف زدہ اور پیلا پیلا سا فرد ہے۔"

پھر وہ مجھے اوکاڑے کے بازار میں اکیلا چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

جب میں واپس باغ محلے داراں میں پہنچا تو آم کے تنے سے لگی میری سائیکل چوری ہو چکی تھی!

پوری جان کاری

ہڑپہ سے سات میل جنوب کی جانب "ماھڑا" نامی ایک اور بستی دریافت ہوئی ہے جو ہڑپہ سے بھی دس ہزار سال قدیم کی ایک آبادی ہے۔ اس کے آثار شرقاً غرباً کچھ اس طرح سے پھیلے ہوئے ہیں کہ موجودہ حالات میں اُن کی کھدائی کافی مشکل ہو کر رہ گئی ہے۔ پاکستان کے پاس تو اتنے مالی ذرائع نہیں کہ وہ بلاواسطہ طور پر اس آثار کی کھدائی کروا سکے البتہ سمتھ لوپئین نے اس کے ایک کونے کی رونمائی کے لئے تین ملین ڈالر خرچ کرنے کے بعد یہاں ہر قسم کا کام رکوا دیا ہے کہ ایسے شہر کو آرام سے نکالا جائے گا اور سکون کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

اب تک کی کھدائی کے بعد یہ پتہ چلا ہے کہ "ماہڑا" ایک ترقی یافتہ شہر تھا جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ یہاں کے بہت کم لوگ ہسٹری، فلسفے، الہیات اور قانون سے واقف تھے۔ ماہڑا کے باشندے کم آمیز، کم کوش اور کم سخن تھے اور اُن کے درمیان کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ اُن میں ہر بات کو سمجھنے، پرکھنے اور اختیار کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔

ہڑپہ میں آثار کی کھدائی کا مزید کام کرنے پر جوزف نیٹ مامور تھا۔ اس کے ساتھ باب رابن اور ایدا تولی ریسرچ سکالروں کے طور پر وابستہ تھے لیکن اس میں جوزف کا سب سے بڑا سہارا اس کی بیوی کیرولین تھی جو انتھروپولوجی کے میدان میں روتھ بینے ڈکٹ اور مارگرٹ میڈ کی شاگرد رہ چکی تھی۔ انتھروپولوجی کے تحقیقاتی علمی گروہ کو اچانک چھوڑ کر وہ آثار قدیمہ کی کھدائی کے کام سے منسلک ہو گئی اور پھر اُسے اپنے آگے پیچھے کی کوئی خبر نہ رہی۔ جوزف سے شادی کرنے کے بعد بھی وہ اپنے ہر

کام میں آزاد رہی اور اس آزادی کے سہارے بہت سے معاملات میں جوزف سے بھی آگے نکل گئی۔

جب وہ صبح کی ہڑپے سے نکلی شام تک واپس نہ آئی تو جوزف کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ساہیوال کے نوجوان منڈے اُسے ورغلا کر دریا پار ہی نہ لے گئے ہوں..... لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ دریا کے اُرار ہی لڑکوں کو سب راز بتا دیتی تھی جن کا علم لڑکوں کو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن چونکہ اس علاقے میں کوئی اچھے سکول نہیں تھے اور لڑکے لڑکیاں تعلیم سے بے بہرہ تھے اس لئے کیرولین پرندوں اور مکھیوں کا علم اُنہیں اپنے وجود کے نقشے پر پڑھا دیتی تھی..... مگر آج شام جو اس کی واپسی میں دیر ہو گئی تو اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

اس نے اچانک بابے مودن کی نیائیں میں بیری کے بڈھے درخت کے پاس ایک انوکھی پرانی اینٹ دریافت کر لی تھی جس کا تعلق کسی ایسی قدیم تہذیب سے تھا جو ابھی کتابوں میں مذکور نہ ہوئی تھی۔

کیرولین نے اپنے چرمی تھیلے سے سٹیل کی چھوٹی گینتی نکال کر نیائیں کے شمالی قب پر جو پہلی ضرب لگائی تو گویا اس نے اندر سے آواز دی "ہم ہیں! ہم ہیں! لیکن ذرا آہستہ..... آہستہ اور اس سے بھی آہستہ۔" تھوڑی سے مٹی اکھیڑ کر اس نے برش سے جگہ صاف کی تو اُسے یقین نہ آیا کہ وہ پہلی ہی پیش قدمی میں سیدھے راستے پر آ گئی ہے۔

دو دن اور دو راتیں چھوٹی حویلی میں گزارنے کے بعد جب وہ ہڑپہ کی سائٹ پر آئی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ آنکھیں سرخ انگارہ بن چکی تھیں اور ہونٹوں پر پپڑیوں کے موٹے موٹے چھلکے مونگ پھلی کے دانے کی لال پرت کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ اس نے جب اپنی خرخری آواز میں چیخ کر جوزف کو بتایا کہ اُدھر ہزاروں سال کی غرقیدہ ایک اور بستی بھی موجود ہے تو جوزف اُسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر دیوانہ وار اُس طرف کو بھاگا اور راستہ بھر خوشی کی خوف ناک چیخیں مارتا گیا کیونکہ اُسے اپنی بیوی کی فطانت کے ساتھ ساتھ اس کی کشفی کیفیت پر بھی بڑا اعتماد تھا۔

جب وہ دونوں اس مقام پر پہنچے تو جوزف نے کیرولین کو اپنے ساتھ چمٹا کر اس

نئی ڈسکوری پر شدت کے ساتھ اُس کا منہ چومنا شروع کر دیا۔ جب بکریاں چرانے والے لڑکوں نے یہ نظارا دیکھا تو اُنھوں نے کھیت سے ڈھیلے اُٹھا اُٹھا کر اُن پر برسانے شروع کر دیئے۔ اگر اُن چرواہوں کا دائرہ اُن کے بہت ہی قریب نہ آجاتا تو پتہ نہیں وفورِ شوق سے کیا ہوتا! بہرکیف کھدائی کے لئے بستی کا ایک کونہ انگڑائی لے کر ان کے سامنے آگیا اور ایک نئی دُنیا دریافت ہو گئی۔

ہڑپہ میں ڈیڑھ سال سے جو کام ہو رہا تھا' وہ تو التوا میں پڑ گیا اور ہڑپہ کے جنوب میں ماہڑا نامی بستی میں کھدائی شروع ہو گئی۔ اٹلی' چیکوسلوکیہ اور امریکا کے تین ماہرین آثار قدیمہ سائٹ پر پہنچ گئے۔ متعلقہ لیب کا بہت سا سامان بذریعہ ہوائی جہاز لاہور اور لاہور سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ماہڑا پہنچ گیا۔ لیب میں اس بستی کی قدامت کے آثار ٹیسٹ ہونے گئے۔

پتہ چلا کہ یہ بستی نہ صرف اپنے عہد کی ایک ترقی یافتہ بستی تھی بلکہ آج کے حوالے سے بھی ایک ایسی آبادی تھی جس میں وہ تمام ساز و سامان موجود تھا جس کی ہم آج سے کوئی دو سو سال بعد اپنے شہروں میں ہونے کی توقع کرتے ہیں۔ موقع پر موجود سب ماہرین آثار قدیمہ اس حقیقت پر متفق تھے کہ یہ شہر' یہ میٹروپولیٹن شہر سائنس اور ٹیکنالوجی کا معبد تھا اور یہاں کی زندگی اور زندگی کا ہر چلن سائنٹفک بنیادوں پر استوار تھا۔ یہاں ہر طرح کا علم..... سائنسی علم' روزمرہ کا علم' دینی اور روحانی علم' حیوانی اور سفلی علم غرضیکہ ہر طرح کا علم اپنے نکتہ عروج کو پہنچ چکا تھا اور اس کے بعد کسی اور علم کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ساری آبادی معلومات سے لبریز ہو گئی تھی!

لوگ خوبصورت تھے..... صحت مند اور خوش حال تھے..... فکر معاش اور فکر معاد سے آزاد تھے۔ زندگی گزارنے کے لئے ہر طرح کی آسانی موجود تھی اور سفر کے ہر طرح کے ذرائع عام تھے حتیٰ کہ انسانی وجود بھی الیکٹرانک سگنل کی طرح ایک مقام سے دوسرے مقام تک بہ آسانی پہنچائے جاتے تھے۔

چونکہ کھیتی باڑی' صنعت و حرفت' تجارت اور کاروبار سب سائنس کے زور پر ہوتے تھے اس لئے لوگوں میں اقتصادی اُونچ نیچ نہیں تھی اور سارا معاشرہ ایک ہی بنیاد

پر قائم تھا۔ طبقاتی کشمکش نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا علم ہی نہ تھا اور جسمانی اور بدنی بیماریاں اس لئے ناپید تھیں کہ پیدا ہوتے ہی سارے بچوں کو جملہ بیماریوں کے خلاف ٹیکہ بند کر دیا جاتا اور ہر وجود امیون ہو جاتا تھا۔ جنسی آزادی اس درجہ تھی کہ کوئی شخص بھی بے راہ روی کا شکار نہ تھا' نہ مرد نہ عورت! ہر کوئی دوسرے کو جنسی طور پر جانتا تھا!

تعلیم اور معلومات عامہ کا حصول لازمی تھا اور اس کے لئے کوئی معاوضہ یا فیس مقرر نہیں تھی۔ ہر محلے کے ہر کونے پر علم کدے موجود تھے اور ہر علم کدے میں سو سو معلومات سینٹر تھے۔ کچھ لوگوں نے اپنے گھروں میں بھی کمپیوٹر لگائے ہوئے تھے جو علم کدوں سے اور معلومات سینٹرز سے پیچاں تھے۔ جس کو جس قسم کی معلومات درکار ہوتی تھیں، کمپیوٹر پر ایک انگلی چلا کر حاصل کر لی جاتی تھی۔ ہر ایک کو ہر وقت اپنی بڑھتی گھٹتی حیثیت عرفی کا علم ہوتا رہتا تھا۔ ہر کلائی پر اس قسم کا میٹر بندھا ہوتا تھا جو وجود کے اندر باہر، اردگرد اور آس پاس کی خبر دیتا رہتا تھا۔

"ماہڑا" کے لوگوں کے پاس اتنا علم تھا اور علم عطا کرنے کے اتنے وسائل تھے کہ انہوں نے ماہڑا کے باشندوں کی زندگی سے ہر طرح کے سر، بھید، رمز اور مسٹری کو نکال دیا تھا اور وہ حیرت اور تجسّس کی دیہاتی جبلت سے بالکل آزاد ہو گئے تھے۔ اُن کے لئے کوئی راز راز نہیں تھا اور کوئی مسٹری مسٹری نہیں رہ گئی تھی۔ اُن کو ہر شے کا علم اور ہر علم کی تشریح معلوم تھی۔

"ماہڑا" کا معاشرہ وہ خوش قسمت معاشرہ تھا جس کے ہر فرد کو ہر چیز معلوم تھی اور اُن کے درمیان کبھی مناظرہ، مکالمہ، مجاولہ یا مباہلہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ لڑنے جھگڑنے کے فن سے ناآشنا تھے اور محبت اور یگانگت کی خوش گوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ اول تو اُن کو دُنیا کے سارے سوالوں کے جواب معلوم تھے اور اُن کے لئے کوئی بھید، بھید نہیں رہ گیا تھا پھر بھی اگر اُن کو کسی بھید کی تفصیلات معلوم کرنا ہوتی تھیں تو وہ اپنے محلے کے علم کدے میں جا کر بڑے کمپیوٹر کا بٹن دبا کے ساری معلومات حاصل کر لیا کرتے تھے۔ کیا مرد، کیا عورتیں سبھی علم کی ایسی آب یاری سے روشن روشن چہرے لے کر گلی محلوں میں گھوما کرتیں اور تفریحاً ایک دوسرے کو چوما کرتیں۔ ○

لوگوں کو چونکہ سارے سوالوں کے جواب آتے تھے اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے ساری آبادی، سارے ماحول اور ساری خدائی کو Demystify کر دیا تھا اس لئے لوگ زیادہ تر دیواروں کے ساتھ ڈھو لگا کر بیٹھے رہتے تھے اور لذت معلوم کے نشے میں ڈوبے ایک دوسرے کو تکا کرتے تھے۔

بچے بھی سب کچھ جانتے تھے، عورتیں بھی جانتی تھیں، بڈھے باب بھی آگاہی کی بیساکھیوں پر پڑے جھولتے تھے۔ ہر طرف جان کاری ہی جان کاری تھی۔ چنانچہ ہر شخص علم کی ڈور میں لپٹا ہوا تھا اور علم ہی اُن کی واحد میراث تھی۔

"ماہڑا" کی بستی میں عشق و محبت کا جھمیلا نہیں تھا۔ نہ کوئی عاشق تھا نہ معشوق، نہ رقیب نہ محتسب۔ ہر ایک کو ہر ایک کی ڈیوٹی کا پتہ ہوتا تھا، کسی کا کسی سے کوئی رگڑا جھگڑا نہ تھا۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلتا تھا اور ہر شے علم و ابلاغ کی ڈوری سے بندھی تھی۔ ہر ایک کو اپنے محبوب کی موجودگی کا، اس کے موڈ کا، اس کے ٹمپریچر اور بلڈ پریشر کا علم ہوتا تھا۔ جو کوئی اپنے محبوب کے لئے زیادہ غلطاں ہوتا، وہ کمپیوٹر پر اس کا ای سی جی اور سی ٹی سکین کر کے بھی دیکھ لیتا تھا۔ بھرپور علم کی بدولت اور ہر طرح کی معلومات میسر ہونے کی وجہ سے کوئی تحیر اور تجسس میں مبتلا نہیں تھا اس لئے کسی قسم کی تانکا جھانکی، خطوط بازی یا فون نوازی نہیں ہوتی تھی۔ جب سب کو ایک دوسرے کا علم ہی تھا کہ کس رنگ میں ہے تو پھر سر اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے سے فائدہ۔ سب مزے میں تھے اور سب تکیوں پر سر رکھ کر فری علم کے اور مفت معلومات کے مزے لوٹتے تھے۔ یہ دُنیا کا سب سے بڑا نشہ تھا!

یہ جو ہمارے معاشروں میں ہر وقت ایک افراتفری، بھاگا دوڑی، تانا بھاری اور بوجھ بجھول سی لگی رہتی ہے اور ہر فرد، ہر معاشرہ، ہر گروہ اور ہر ملک دوسروں کی کنسوئیاں لیتا رہتا ہے تو یہ بات ماہڑا کی عظیم الشان بستی میں نہیں تھی۔ ساری راج دھانی میں نہ تو کوئی سی آئی ڈی تھی نہ سی آئی اے، نہ ایف آئی ڈی نہ کے جی بی، نہ را نہ موساد۔ ہر قسم کی انفریشن اول تو پہلے ہی ہر کسی کے پاس تھی اور جو کوئی ایک آدھ بات معلوم نہ ہوتی تو اُسے بٹن دبا کے معلوم کیا جا سکتا تھا.....

کیرولین کا اندازہ تھا کہ ایسا علم، ایسا وسعت پذیر احاطہ معلومات اور حلقہ آگہی

اس سے پہلے کی مرقومہ یا تذکر شدہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ہر شخص سائنس کے معمولی مفروضوں سے لے کر بلند سائنس کے پیچیدہ رمزی قاعدوں سے بہ طیب خاطر واقف تھا اور ہر مشاہدے کی جمع بندی بڑی آسانی کے ساتھ خود ہی کر لیتا تھا۔

یہ وہ عہد تھا جس کا معمولی سے معمولی مزدور اور ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن بھی سائنس کے عمومی تقاضوں کو ٹاک براہے، کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور آئن سٹائن سے بہتر سمجھتا تھا اور اس کی راہ میں کوئی اُلجھن یا کٹھنائی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ لوگ علم کی ایسی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے کہ اُن کے درمیان کسی قسم کی منافقت، پرخاش یا کھٹاپٹی باقی نہیں رہی تھی۔

مگر اس روش تک علم کے پھیل جانے کی وجہ سے لوگ بڑے پرسکون تھے۔ اُن کو سکون دل بھی میسر تھا اور سکون جان بھی اور وہ مجموعی اعتبار سے سکون خانہ اور سکون معاشرہ کی مشترکہ نعمت سے فیض یاب تھے۔

"ماہڑا" کے لوگ چونکہ خیریت و عافیت کے چھتر تلے زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ سارے سوالوں کے جواب نکال کر فارغ ہو گئے تھے اور اُن کے پاس تحیر، تجسّس اور تیغ کاوی کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا اس لئے وہ گروہ در گروہ تنزل اور انحطاط کی طرف جانے لگے تھے اور اُنہوں نے اپنے زوال کے لئے وہی راہ اختیار کر لی تھی جو رو بہ انحطاط قومیں اپنی بے علمی، بے عملی اور عیش پسندی کے زمانے میں اختیار کر لیا کرتی ہیں۔ راستہ وہ نہ تھا جو سپین کے آمروں، مغل سلطنت کے شہنشاہوں، رومتہ الکبریٰ کے سینٹروں اور اودھ کے تاج داروں نے اختیار کیا تھا لیکن منزل وہی تھی..... تنزل، انحطاط اور زوال کی منزل۔ اُنہوں نے جہالت کا راستہ اختیار کیا تھا اور ماہڑا والوں نے علم کا۔ لیکن انجام ایک سا رہا!

اٹالدی اور چیک مارین کا اندازہ تھا کہ "ماہڑا" میں علم کی فراوانی اور سائنس کے پھیلاؤ کا یہ دور دس سال سے زیادہ کی مدت پر محیط نہیں تھا لیکن کیرولین اور جوزف اُسے پوری نصف صدی پر پھیلا ہوا سمجھتے تھے اور اس کے ٹھوس دلائل مہیا کرتے تھے کہ اتنے علم کے باوجود اور ہر شے کو جان چکنے کے باوصف ماہڑا کی سنگ یشب کی تختیوں پر تین نظمیں، پانچ لوک کہانیاں اور ایک بیان ایسی لوک دانش کا بھی

ملتا ہے جس میں اس وقت کے محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں اور اکھان وغیرہ درج ہیں۔ ان دونوں میاں بیوی کا یہ کلیم تھا کہ سائنسی علوم سے سو فیصدی جان کاری کے باوصف ماہڑا کے پانچ آدمی اب بھی تحیر اور تجسّس میں مبتلا تھے اور وہی لوگ نظمیں اور کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک کی نوجوان بیٹی بھی تھی جو شہزادہ جاہریا کے عشق میں مبتلا تھی۔ یہ لڑکی اپنے گہرے عشق اور لگن پریم کی وجہ سے علم پر توجہ نہ دے سکی تھی اور ناخواندگی کی وجہ سے نظمیں بنایا کرتی تھی — اُن چند نوشتوں سے اور اُن کے مضامین کے موضوعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "ماہڑا" کی تہذیب کم و بیش نصف صدی پر محیط رہی اور یہاں کے لوگوں نے اپنے ہنر و خبر کی بدولت اور علوم کیمیا، سمیا، اور ریمیا کو اپنا کر ایسی کامیاب زندگی بسر کی جس کے خواب آج کا زمانہ اور اس دور کا ہر فرد دیکھ رہا ہے۔ لیکن سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی جتنی "ماہڑا دور" میں ہو چکی تھی!

حال ہی میں ماہڑا کے کھنڈرات سے تانبے کی ایک ایسی تختی ملی ہے جس پر بارہ کے بارہ دیوتاؤں کی خطی تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں دھوپ کی روشنی میں، بلب کی روشنی میں اور موم بتی کی روشنی میں الگ الگ احوال بیان کرتی ہیں اور اُن دیوتاؤں کے فعل مختلف صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کیرولین کا اندازہ ہے کہ یہ ایک الیکٹرانک پلیٹ ہے جس کے اندر ایسے Chip لگے ہیں جو ظاہری آنکھ کو نظر نہیں آتے۔ جب اس پلیٹ کو میگنیٹک فیلڈ سے گزارا جاتا ہے تو اس میں سے اُس عہد کے درندوں کی دھاڑیں اور چنگھاڑیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

جوزف اور کیرولین کی تحقیق کے مطابق تانبے کی یہ تختی اُس تہذیب کا تاریخی عہد متعین کرنے میں ممد ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کی مٹی ہوئی جھریٹ سے اس عہد کا ریکارڈ کیا ہوا یہ فقرہ پورے کا پورا سمجھ میں آ جائے جو شروع تو یہاں سے ہوتا ہے کہ "آہ ہم کو علم کی فراوانی اور دانش کی افراط اور حیرت و تحیر کی نایابی نے برباد کیا! کاش ہمارے سائنسی پروہت اور فنی کرمچاری ......" لیکن اس کے بعد آواز ڈوب جاتی ہے۔ آڈیو سگنل تو آتا ہے لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔

ان الفاظ کو سننے اور سمجھنے کے لئے کیرولین یہ تختی ایک مخملی بیگ میں پیک کر

کے ایم آئی ٹی کی الیکٹرانک لیبارٹری میں پہنچ چکی ہے۔ لیکن جوزف کہتا ہے "کیرولین بکواس کرتی ہے۔ وہ تختی ٹیسٹ کروانے یا اس کی آواز سننے نہیں گئی بلکہ اپنے پُرانے یار سے ملنے گئی ہے جو الیکٹرانک لیب میں کام کرتا ہے۔ وہ دونوں نئے سرے سے میگنیٹک فیلڈ سے گزر کر دیکھیں گے کہ کیرولین کے شادی کر لینے کے بعد بھی اُن دونوں کے درمیان کس قدر محبت باقی ہے..... اُن کے پول ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں یا جھٹکے مار کر دھکا دیتے ہیں۔ اگر تو ان دونوں کے درمیان وہ پرانی کشش قطعی طور پر متعین اور مصمم ہو جاتی ہے پھر تو کیرولین واپس نہیں آئے گی اور اسی حرام زادے کے فلیٹ میں چلی جائے گی — لیکن میرا مشاہدہ بتاتا ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے گی۔ ٹھیک ہے نہ آئے۔ رہے اُسی کے پاس — مرے یا جیئے، مجھے اس سے سروکار نہیں لیکن تحقیق کا کام نہیں رکنا چاہیے۔ اب میں یہ کام اکیلا کروں گا اور اس حقیقت کی تلاش کرکے رہوں گا کہ ماہڑا نامی بستی کے لوگ اتنی عظیم اور ارفع سائنسی ترقی کے باوجود وفا آشنا کیسے رہے اور ان کے اندر انسانی قدریں کیونکر بحال رہیں!"

آج کل جوزف کی غیر ملکی مالی امداد بند ہو چکی ہے اور وہ ساہیوال کے ایک ڈھابے میں فقیرانہ زندگی بسر کر رہا ہے — مگر تحقیق کا سلسلہ جاری ہے!

قلارے

کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وسیع و عریض کائنات میں اور سیاروں ستاروں کی حسین و جمیل دُنیا میں آپ اپنی پسند کا ایک ستارہ خرید کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال بھی سکتے ہیں اور اس کی لینڈ سکیپنگ کر کے وہاں اپنی مرضی کا سائن بورڈ بھی لگا سکتے ہیں۔

ابھی تک کوئی دس بارہ ہزار ستارے بک چکے ہیں اور تقریباً تمام خریدنے والے اُن کا قبضہ بھی لے چکے ہیں۔ اُن ستاروں کی خرید و فروخت کا کام دُنیا کے سبھی ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے لیکن امریکا کے رئیل اسٹیٹ اداروں کا اس بزنس پر خصوصی قبضہ ہے۔ اگر آپ امریکا سے باہر رہائش پذیر ہیں تو 800-323-0766 پر فون کر کے اپنی پسند کا ستارہ خرید سکتے ہیں۔ پہلے تو تیس ڈالر میں اس دنیا کے لگ بھگ ایک بہت ہی اچھا ستارہ مل جاتا تھا لیکن اب عالمی مہنگائی کے پیش نظر اس کی قیمت میں سو فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ ساٹھ ڈالر میں ایک خوبصورت اور "چمک دار" ستارے کا پورے کا پورا مل جانا ایسی بڑی جائیداد غیر منقولہ ہے جو آپ کی اگلی سو بلکہ اس سے بھی زیادہ پشتوں کے کام آ سکتی ہے۔ اور آپ بڑے سکون اور تسلّی کے ساتھ سفر آخرت کر سکتے ہیں کہ اپنے لواحقین کے لئے اتنا بہت کچھ چھوڑ مرے!

یہ ستارے آپ کسی بھی ملک کے پراپرٹی ڈیلر سے خرید سکتے ہیں لیکن اُن کی رجسٹری اور ان کی جمع بندی کا کام بہرحال سوئزر لینڈ میں ہو گا۔ کل کائنات کے ستاروں کا محکمہ مال سوئزر لینڈ میں ہے جہاں سودا ہونے کے بعد اعلیٰ درجے کے بانڈ پیپر پر لیزر پرنٹنگ میں رجسٹری کا کاغذ تیار ہوتا ہے۔ اس رجسٹری کی نقل بڑی حفاظت کے ساتھ جنیوا کے مال خانے میں رکھی جاتی ہے۔ پھر اس کے کوائف کا پورا اندراج لائبریری

آف کانگرس کے رجسٹر میں ہوتا ہے اور اس اندراج کے بعد جنیوا کے دفتر سے اصل رجسٹری خریدار کو بھجوا دی جاتی ہے۔

اس رجسٹری کے ساتھ ایک خوبصورت چارٹ بھی سپلائی کیا جاتا ہے جس میں کائنات کی اس سائیڈ کے ستاروں کا نقشہ ہوتا ہے جہاں آپ نے ستارہ خریدا ہوتا ہے۔ اس خوبصورت اور رنگین چارٹ کے اندر ستاروں کی پوزیشن میں آپ کے خریدے ہوئے ستارے کی وضاحت اور اس کے رقبے کی تفصیلات چارٹ کے حاشیے پر رقم ہوتی ہیں۔

مردان کا خوبصورت شہزاد جو گزشتہ تین سال سے ایم آئی ٹی میں ایسٹروفزکس میں ایم ایس سی کر رہا تھا ایک روز بالکل تھک گیا۔ وہ جو ایکوئیشنز حل کر رہا تھا' اُن سے گندھک اور گندے بروزے کی ایسی بدبو اٹھنے لگی تھی کہ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر سڑک کنارے سبزے کے ساتھ ساتھ چل کر اُس کو آزادی اور تروتازگی کا احساس ہوا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی دراز قد' خوش پوشاک' خوش ادا اور تھرکوا منگیتر رعنا اس کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ شہزاد دونوں بازو کھول کر کھڑا ہو گیا تو رعنا اس کے قریب سے غزال تاتاری کی طرح چوکڑیاں بھرتی آگے کو نکل گئی۔ اور جب شہزاد کے اُٹھے ہوئے بازو اپنے پہلوؤں پر گر گئے تو رعنا کا ہیولا ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

جب وہ واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے کاغذ' گراف اور لاگ رتھم ابھی تک ویسے ہی کھلے پڑے تھے اور اُسے اپنے حصے کی اسائن منٹ ختم کر کے لیٹنا تھا۔

یہ جو رعنا اپنے پھول دار بہاریہ لباس میں اس کے قریب سے گریز کرتی ہوئی نکلی تھی تو شہزاد کچھ مشکوک سا ہو گیا تھا۔ شک کرنے کی کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی لیکن وہ جس قبیلے میں پیدا ہوا تھا' اس تعلق سے شہزاد کو ہر آہٹ پر شک کرنے کا پورا پورا اختیار تھا۔ اس کے اندر کئی صدیوں سے چٹانوں کے پیچھے کی آہٹ خبردار کرنے کا ایک ذریعہ بن چکی تھی اور اب جو رعنا اس کے بہت ہی قریب سے کھٹ مار کے گزری تھی اور رکنے کی کوئی رمز یا اشارہ نہیں دیا تھا تو شہزاد کے اندر ایک وسوسے کا پیدا ہونا لازمی سا ہو گیا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا اور کام

میں مصروف ہو گیا۔

رعنا نے فیکس پر شہزاد کو اپنے نئے چارکول ڈیزائن کا چربہ بھیجا تھا جس میں وہ ستاروں پر پاؤں دھرتی اُوپر ہی اُوپر چڑھتی جا رہی ہے اور چھوٹے چھوٹے سیارچے خلخال بن کر اس کے پاؤں کے گرد بجتے چلے جا رہے ہیں۔ خاکے کے کونے میں لکھا تھا "میں تم سے بہت ہی پیار کرتی ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

شہزاد نے اپنی محبوب منگیتر سے بالکل تنہائی میں اور ایک گہرے سناٹے میں ملنے کے لئے ساٹھ ڈالر کا ایک نہایت ہی خوبصورت ستارہ خریدا اور اُسے "قلارے" کا نام دے کر رجسٹری کے لئے جنیوا اطلاع بھجوا دی۔

لیکن جب وہ ستارہ خرید چکا اور ادائیگی کر چکا تو اُسے پتہ چلا کہ ایک دوسرے کے گرد گھومنے والے ستاروں کا ایک جوڑا ایک سو بیس کے بجائے سو ڈالر میں مل جاتا ہے۔ اُن میں دو محبت کرنے والے اپنے اپنے مدار میں رہ کر ہر گھوم پر ایک دوسرے سے بغلگیر بھی ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے کو چوم بھی سکتے ہیں۔ اُسے افسوس تو ضرور ہوا کہ ایسے سودے کا بعد میں علم ہوا لیکن اتنی بڑی موجود جائیداد کا واحد مالک ہونے پر خوشی بھی بے انتہا ہوئی۔ اس ستارے میں کئی مردان، کئی پاکستان، کئی ایشیا، کئی افریقہ اور کتنے ہی گوبی، کالاہاری اور بحرالکاہل ایک ساتھ سما سکتے تھے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پردیس میں، ایک طالب علم کی حیثیت سے رہ کر بھی اس نے اتنی بڑی جائیداد بنا لی۔

جب شہزاد نے رعنا کو ای میل کے ذریعے اطلاع دی کہ اُس نے کہکشاں سے بائیں ہاتھ، بہت نیچے، اُفق کے قریب بھورے رنگ کا ایک ستارہ خرید لیا ہے اور اس کی رجسٹری کے کاغذات سیدھے رعنا کو روانہ کر دیئے ہیں تو پہلے تو رعنا کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ شہزاد کہہ کیا رہا ہے لیکن جب اس کو رجسٹری کی تفصیلات اور ستاروں کے جھرمٹ میں اس کے ستارے کا محل وقوع اور شجرہ موصول ہوا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ یہ سب کچھ اُٹھا کر بھاگی بھاگی پروفیسر ندیم کے کمرے میں پہنچی جہاں وہ ایک بڑی میورل پر چیڑا لاکھ کا ٹرانس پیرنٹ کوٹ دے رہے تھے۔ سارے کمرے سے نتھیا گلی کے پہاڑوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ پروفیسر ندیم کے سانس سے پرسکون، خاموش

اور چپ چاپ بہتے ہوئے ٹھنڈے پانیوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنی میورل سے بہت خوش تھے اور اُن کی میورل اپنے وجود میں آنے پر اُن سے بھی زیادہ خوش تھی۔

رعنا ٹیکسٹائل ڈیزائن کی طالبہ ہونے کی بنا پر پروفیسر ندیم کی شاگرد تو نہ تھی لیکن اس کو سارے سٹاف میں ایک یہی اُستاد سب سے اچھے لگتے تھے کہ یہ رافیل جیسے حسین اور مائیکل اینجلو جتنے محنتی تھے۔ اگر دانتے کی جوانی کی کوئی تصویر ہوتی تو وہ یقیناً پروفیسر ندیم کی شبیہ ہوتی۔ چونکہ وہ جوانی کے دانتے اور آج کے دانتے تھے اس لئے رعنا دل ہی دل میں بیٹرس بن گئی تھی اور اس کی روزمرہ کی پیش قدمیاں کالج میں کافی واضح ہو گئی تھیں۔

رعنا بھاگی بھاگی پروفیسر ندیم کے کمرے میں داخل ہوئی اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولی "سر ہم نے ایک ستارہ خرید لیا ہے..... کہکشاں کے بائیں ہاتھ، عین نیچے، اُفق کے قریب۔ چاند سے پچیس لاکھ میل دور بھورے رنگ کی زمین ہے سر اور جامنی کلر کا آسمان۔ آپ چلیں گے دیکھنے؟"

پروفیسر صاحب نے ہنس کر کہا "اگر تم ساتھ لے جاؤ گی تو ضرور چلیں گے ورنہ ہم تو راستے میں ہی بھٹک جائیں گے۔"

رعنا نے کہا "نہیں سر، ہم اکٹھے جائیں گے اور اکٹھے وہاں پکنک منائیں گے۔" پھر اس نے ذرا اترا کر کہا "شہزاد نے خریدا ہے سر، فارن ایکسچینج میں پے منٹ کر کے۔ میں آپ کو اس کا نقشہ دکھاتی ہوں اور اس کا مقام سمجھاتی ہوں۔"

پھر اس نے فیکس میں آئے ہوئے چارٹ پروفیسر صاحب کی میز پر پھیلا کر اپنے ستارے کی پوزیشن سمجھانی شروع کر دی۔ چارٹ میں ستارے کے سارے کوائف درج تھے اور اس کا ہر مقام کرہ ارض کے حوالے سے متعین کیا گیا تھا۔ رجسٹری کی کاپی دیکھنے کے بعد پروفیسر ندیم نے پوچھا "یہ سارا ستارہ تم لوگوں کا ہے؟" تو رعنا نے گھمنڈی لڑکی کے انداز میں اٹھلا کر کہا "سارے کا سارا ہمارا سر، لیکن اس میں ایک ملک آپ کا بھی ہو گا..... جونسا آپ پسند فرمائیں..... جہاں آپ اپنی حکمرانی قائم کرنا چاہیں..... جہاں آپ اپنا ٹکٹ سکہ چلانا چاہیں۔"

پروفیسر ندیم نے اس کے لفظ "جون سا" پر محبت بھری نظروں سے رعنا کو دیکھا

اور پھر سوچا کہ چار سال پیشتر تھرڈ ایئر کی ایک اور لڑکی بھی اُن کی شخصیت کے سحر میں اسی طرح گرفتار ہو گئی تھی اور اُسے بڑی مشکل سے دھکے دے کر باہر نکالنا پڑا تھا۔ پروفیسر ندیم چونکہ ٹھرکی قسم کے مرد نہیں تھے اس لئے اُن کی شخصیت میں ایک ایسی موہنی تھی کہ زہری سے زہری ناگن بھی اُن کے آگے بینتی کرتے ہوئے لہرانے لگتی تھی۔

رعنا نے کہا "آپ میرے ساتھ ہمارے ستارے میں چلیں گے ناں سر؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" پروفیسر ندیم نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "ضرور چلیں گے اور پھر سارا دن تم لوگوں کے ساتھ گزاریں گے۔"

رعنا نے کہا "سر ہمارا ستارہ ایسے محفوظ مقام پر واقع ہے کہ وہاں نہ تو اُسے کسی بلیک ہول کا خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی اس کے قریب کوارکس کی آبادی ہے۔ بس سکون ہی سکون ہے، محبت ہی محبت ہے۔"

پروفیسر ندیم نے مسکرا کر کہا "تم تو اپنے ستارے کی باتیں ایسے کر رہی ہو جیسے تم نے اُسے گھوم پھر کر دیکھا ہو!"

رعنا نے کہا "سر! میں ابھی وہاں گئی تو نہیں البتہ میں نے اُسے چشم تخیل سے ضرور دیکھا ہے اور اُسے اپنی آرزوؤں کے عین مطابق پایا ہے۔" پھر اس نے اندر ہی اندر خوش ہو کر کہا "سر! اگر آپ کی بیگم ہوتیں تو ہم اُنہیں بھی ساتھ لے چلتے، لیکن آپ نے شادی ہی نہیں کی — آپ نے کیوں شادی نہیں کی سر؟"

"کی ہے بھائی، کی ہے۔" اُنہوں نے پھر اس کے کندھے پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ میرا فن میری شادی ہی تو ہے اور یہ میری پینٹنگز اور میورلز میری دلہنیں ہی تو ہیں۔ اس کے سوا مجھے اور کیا چاہیے!"

رعنا کو پروفیسر صاحب کے منہ سے یہ سن کر اور بھی اچھا لگا کہ اُنہوں نے شادی نہیں کی اور آئندہ بھی ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن وہ اپنے مزاج کے مطابق محبت اور رومانس کے اردگرد گھومتے ضرور رہیں گے۔

شہزاد اپنی یونیورسٹی کی آبزرویٹری میں گھس کر رات گئے تک اپنے ستارے کو غور سے دیکھا کرتا اور ابراہیمی مسلک کے مطابق یہی سوچتا رہتا کہ شاید یہ

ہے میرا ستارہ۔ صبح ہو جاتی اور وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتا۔ اس کا خیال تھا کہ ان بہت سارے ستاروں میں سے تین ایسے ضرور ہیں جن میں سے ایک اس کا اپنا زرخرید ستارہ ہے اور اس کے اندر کچھ ایسے عجائبات ضرور موجود ہیں جنھوں نے اس ستارے کو ایک خصوصی مقام عطا کر رکھا ہے۔ اُسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ایک روز جب وہ وہاں پہنچے گا تو بہت ساری حقیقتیں عیاں ہو کر اس کے قدموں میں مصر کے بازار کی طرح پھیل جائیں گی۔

اُنہی دنوں ہبل دوربین نئی نئی بن کر اپنی رصدگاہ میں فٹ ہوئی تھی۔ شہزاد نے اس رصدگاہ میں پہنچنے کے لئے ان تھک کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ہبل دوربین سکیورٹی کا بہت بڑا مسئلہ تھی اس لیے کسی غیر معروف سکالر یا نامطلوب طالب علم کو اس علاقے میں پہنچنے کی اجازت ہی نہ تھی۔

رعنا نے جب اپنے ابا جی کو بتایا کہ شہزاد نے کہکشاں کے قریب ایک ستارہ خرید کر اُسے اپنے نام چڑھوا بھی لیا ہے تو اُن کو اپنی سب سے ذہین اور سب سے خوبصورت بیٹی کی فکر لاحق ہو گئی کہ شادی کے بعد جب وہ اپنے سسرال جا کر ایسی باتیں کرے گی تو اس کا کیا بنے گا!

شہزاد کی آرزو تھی کہ وہ رعنا کو بتائے بغیر اکیلا کسی روز "فلارے" جائے اور وہاں سب کچھ سیٹ کر کے اور مرغزاروں، وادیوں، کہساروں اور جنگلوں کی تزئین کر کے چپ چاپ واپس آ جائے۔ اور پھر جس روز وہ رعنا کو ساتھ لے کر اپنے علاقے میں پہنچے تو رعنا خوشی کی ایک چیخ مار کر اس کے سینے سے چمٹ جائے کہ واہ شہزاد، تو نے کمال کیا..... اپنے باپ دادا کا نام روشن کر دیا۔ شاد باش و شاد زی!

اُنہی دنوں ہوسٹن میں ہمالیہ کا ایک یوگی آیا تھا جس کے چیلوں کا دعویٰ تھا کہ گورو مہاراج کی عمر پانچ سو برس کی ہے اور یہ دوسری مرتبہ اپنی گپھا سے برآمد ہوئے ہیں۔ گورو مہاراج کپالی چڑھا کر بیٹھ جاتے تھے اور سو سو ڈیڑھ سو برس ایسے ہی گزار دیتے تھے۔ ان دنوں یہ گورو صاحب امریکا میں سدھی کا درس دینے آئے تھے اور دُکھی جنتا کو یہ بتانے آئے تھے کہ یہ مال و دولت دُنیا سوائے وہم و گمان کے اور کچھ بھی نہیں..... انسان اس سے اُوپر ہو کر زندگی گزارنے کے لئے آیا ہے اور وہ مارگ جو اس

نے ہزاروں ورش پہلے چھوڑ دیا تھا، اُسے ڈھونڈنے کے لئے آیا ہے۔

امریکا کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جوق در جوق ہوسٹن کی طرف رجوع کرنے لگے اور دیکھتے دیکھتے وہاں لاکھوں کا مجمع لگ گیا۔ شہزاد بھی بوسٹن سے کھسک کر ہفتہ بھر کی سدھی کا سبق لینے ہوسٹن پہنچ گیا اور وہاں کی بھیڑ میں رل مل گیا۔

گورو دیو کے ایک سو پچاس چیلے مختلف گروہوں میں سدھی کا درس دیتے تھے اور ایک ہفتے میں بندا تیار کر کے اُوپر اُٹھا دیتے تھے — اپنے کنول آسن کے پانچویں روز شہزاد نے محسوس کیا کہ وہ زمین سے اُوپر اُٹھ رہا ہے اور کمرے میں میز کی سطح پر آ گیا ہے۔ اس سے اُوپر اُس سے اُٹھا نہ گیا اور وہ واپس زمین پر لینڈ کر گیا۔

بوسٹن واپس پہنچ کر اُس نے اپنی مشق جاری رکھی اور وہ رات کی تاریکی میں سطح زمین سے سو سو فٹ اور اُوپر اُٹھ کر پھرنے لگا اور سوئے ہوئے بوسٹن کی سیر کرنے لگا۔ واہ! کیا سیر تھی..... کیا مزے تھے اور کیسی لذت تھی کہ اس کی دھت اور چاٹ بھوگ اور رنگ رس سے بھی اُوپر نکل گئی۔

ایک روز شہزاد اپنی سدھی کے نشے میں بدمست، انجام سے بے خبر، مال سے لاتعلق اپنے مقدور اور مجال سے آگے نکل گیا۔ جونہی گورو مہراخ کے بتائے ہوئے مارگ سے سمرتھ اُوپر نکلا تو پھر آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اب سدھی اس کے اختیار میں نہیں رہی تھی، وہ سدھی کے کنٹرول میں آ گیا تھا۔ ژوں ژوں کرتے ستارے اور سیارے اس کے قریب سے گزر رہے تھے اور وہ کڑی کمان کے تیر کی طرح اُوپر ہی اُوپر چلا جا رہا تھا۔

کچھ مانوس ستاروں کے ایک محلے سے گزرتے ہوئے شہزاد نے حبس دم کر کے اپنے آپ پر بوجھ ڈالا اور اس کی رفتار بالکل مدھم پڑ گئی۔ جیسے تیز رفتار جہاز کو ایک دم روکنے کے لئے اُس کی دم سے بڑا سا پیراشوٹ نکل کر مخالف سمت کھینچ مارا کرتا ہے، عین اسی طرح شہزاد بھی رکنے لگا۔

اس کا اپنا ستارہ "فلارے" اس کے قدموں کے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑا تھا اور اس کا اُوپر کا حصہ، جہاں صفحہ نمبر لکھے ہوتے ہیں، قدرے اُٹھا سا ہوا تھا۔ عین اس طرح جس طرح خوبصورت باغوں کے سرسبز لانوں پر لڑکے لڑکیاں بیٹھے ہوتے ہیں

اور لڑکوں نے مجسم توجہ بن کر کہنیوں پر بوجھ ڈال کے اپنا دھڑ اُوپر اُٹھایا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح قلارے کا پائن حصہ تھا.... اُوپر کو اُٹھا ہوا، کہنیوں کے بل مشتاق دید سا!

قلارے بڑا ہی خوبصورت ستارہ تھا.... وسیع و عریض، ساکت و صامت، تازہ کٹی گھاس کی خوشبو سے لبریز۔ نیلی گھٹا سے اُترنے والی ٹھنڈی ہوا کے سفید سفید پرت بھورے رنگ کی زمین پر جگہ جگہ پڑے تھے اور سارے میں پلاٹینم کلر کی ملائم اور ہموار روشنی عریاں عریاں سی لیٹی تھی۔

شہزاد کا ستارہ کچھ اتنا بڑا نہیں تھا، پھر بھی کافی تھا۔ ہماری دُنیا سے تقریباً ایک براعظم کم اور ہمارے ہندوکش سلسلہ ہائے کوہ سے ہزار ہزار فٹ نیچے پہاڑ جو دور سے منجمد نیلی گھٹائیں دکھائی دیتے تھے۔ اُن کی چوٹیوں پر برف نہیں تھی، موسیقی کی صداؤں اور انحد باجے کی آواز کا انجماد تھا جو دور سے پیلے اور گلابی رنگ کے برف کے آثار نظر آتے تھے۔

سینکڑوں ہزاروں میل پھیلی ہوئی بھورے رنگ کی اس زمین پر براؤن کلر، کڈنی شیپ میرا زمین کا ایک ٹکڑا تھا.... کوئی پچاس میل لمبا اور بیس بائیس میل چوڑا۔ اس ٹکڑے کی رنگت مدینے شریف کے اُن اُونٹوں کی سی تھی جو مکہ مدینہ موٹروے کے دونوں طرف آزادانہ گھومتے نظر آتے ہیں۔

شہزاد اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر گنگناتا ہوا چلا۔ کچھ خوبصورت فضا کا اثر، کچھ اتنی بڑی جائیداد کا نشہ، کچھ جوانی اور خوبصورتی کی جھلار.... گاتا گاتا کچھ نرت سی بھی کرنے لگا اور نرت کرتا کرتا کافی دُور نکل گیا۔ ایسی تنہائی، ایسا سکون اور ایسا سناٹا اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نرت میں آپ سے آپ اضافہ ہوگیا اور وہ باقاعدہ ناچنے لگا۔ یہ ناچ کسی اُصول کے تحت تو نہیں تھا لیکن اس کی حرکات کا مخرج بڑا بامعنی تھا۔ شہزاد کو خوشی ہوئی کہ وہ ناچ بھی سکتا ہے اور بڑی دُور تک ناچ سکتا ہے۔

لیکن اس کی یہ خوشی ایک دم حیرت، غصے اور اکراہ میں تبدیل ہو گئی جب اس نے فرلانگ بھر کے فاصلے پر ایک جوڑے کو اپنی زمین پر بیٹھے دیکھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ انسان یہاں تک کیسے پہنچ سکا ہو گا لیکن وہ صاف انسان تھے اور انسان کی اولاد

میں سے تھے۔ شہزاد آہستہ آہستہ، سوچتا سوچتا، رکتا رکتا اور کھوجتا کھوجتا اُن کی طرف بڑھتا رہا۔

جب وہ ایک مناسب فاصلے پر پہنچ کر اُن کی پشتوں کے پیچھے رُکا تو لڑکی نے مرد کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنی طرف انڈیلا اور اس کے چہرے پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ مرد نے اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑا اور اس کا چہرہ جھنجھوڑنے لگا۔ لڑکی گھنٹیاں سی بجاتی اتنے زور سے ہنسی کہ شہزاد کو غصہ آ گیا۔ ایک تو اس کی جائیداد پر "ٹریس پاسنگ" دوسرے بے محابا بغل گیریاں، چمیاں اور قہقہے۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے للکار کر اُونچی آواز میں کہا "ہو آر یو پیپل؟" لڑکے اور لڑکی دونوں نے اپنے چہرے گھما کر پیچھے دیکھا تو شہزاد نے پتلون سے اپنا پستول نکال لیا۔

اُسے اس حالت میں دیکھ کر رعنا نے اپنے دونوں ہاتھ تیزی سے ہلاتے ہوئے کہا "نو شہزاد نو، پلیز نو۔ فار گاڈز سیک ڈونٹ ڈو دس!"

جب اُس نے اپنے زمینی ونڈیٹا کے جذبے سے لبریز ہو کر پستول کا گھوڑا چڑھایا تو پروفیسر ندیم نے ہاتھ آگے بڑھا کر "پلیز ٹو میٹ یو ہیئر، شہزاد" کہا اور اس کے مصافحہ کا انتظار کرنے لگا۔ شہزاد نے اپنا پستول واپس پتلون کی جیب میں ڈالا اور پروفیسر ندیم سے لپٹ کر بولا "تو آپ پروفیسر ندیم ہیں! رعنا کے محبوب اُستاد!!"

پروفیسر ندیم نے ہنس کر کہا "میں نہ تو اس کا محبوب ہوں اور نہ ہی اس کا اُستاد۔ اس کے اُستاد تو سر حبیب ہیں، ٹیکسٹائل ڈیزائن کے ماہر۔ میں تو اُن کا پڑوسی ہوں اور ساتھ والے کمرے میں آئل کا کام کرتا ہوں۔"

شہزاد نے رعنا کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے پوچھا "جان من تم یہاں پہنچیں کس طرح؟ یہ تو تقریباً ایک نوری سال کا راستہ ہے۔"

پروفیسر نے کہا "شہزاد صاحب یہ بڑی دیوانی لڑکی ہے، آپ کی منگیتر! پہلے تو اس نے آسٹرل باڈی کا علم سیکھا ایک ڈچ عورت سے...."

"وہ ڈچ نہیں تھی سر" رعنا نے بات کاٹی "وہ برسلز کی رہنے والی تھی۔ لیکن ہمارے یہاں چونکہ برسلز کو کم لوگ جانتے ہیں اس لئے اس نے اپنے آپ کو ڈچ کہنا اور ڈچ کہلوانا شروع کر دیا تھا۔"

"لیکن یہ آسٹرل باڈی کیا ہوتی ہے؟" شہزاد نے پوچھا تو رعنا نے جلدی جلدی اس کا خاکہ بیان کر کے بتایا کہ آسٹرل باڈی دراصل آوٹ آف باڈی کے سفر کا نام ہے۔ جب آدمی بستر پر لیٹا لیٹا اپنے کمرے کے روشن دان میں پہنچ کر اس میں جمی ہوئی دھول اور دھول کے اندر مرا ہوا جھینگر دیکھنے لگ جائے تو آسٹرل باڈی کا پہلا مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔"

"لیکن رعنا نے صرف آسٹرل باڈی پر ہی توجہ نہیں دی" پروفیسر ندیم نے کہا "اس نے کچھ اور بھی کیا ہے اور جب یہ میرا ہاتھ پکڑ کر آتش بازی کی طرح اُوپر کو اُٹھتی ہے تو مجھے ایک تھرتھری سی لگ جاتی ہے۔"

"آپ لوگ کب سے یہاں آ رہے ہیں؟" شہزاد نے لاتعلقی سے پوچھا تو رعنا سوچ میں پڑ گئی۔ پروفیسر ندیم نے کہا "ہم کو تو کوئی مہینے سے اُوپر ہو گیا ہے۔"

"ہر روز یہاں آتے ہیں؟" شہزاد نے چیخ کر پوچھا۔

"نہیں" رعنا نے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا "کوئی کوئی دن ناغہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ ناغہ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

پھر اُن دونوں نے ایک ساتھ کہا "لو بھئی حد ہو گئی" اور پروفیسر ندیم نے پوچھا "آپ یہاں کس طرح سے پہنچے؟ ہمارے یہاں سے تو بالکل سیدھا رستہ ہے عمودی لیکن امریکا سے تو پہلے قطب جنوبی کی طرف پرواز کرنی پڑتی ہو گی۔"

شہزاد نے اُن کو تفصیل کے ساتھ اپنے ہفت خواں سے روشناس کرانے کے بعد پوچھا "آپ کے آسٹرل باڈی میں کوئی شق کمیونی کیشن کی بھی ہے جس سے پتہ چل سکے کہ آپ لوگ کب ٹیک آف کرنے والے ہیں؟"

رعنا نے کہا "میں نے آسٹرل باڈی کا میتھڈ تو کب کا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو ہم ریمیا کے ذریعے یہاں پہنچتے ہیں۔ یہ مشرقی علم ہے اور بالکل فول پروف ذریعہ ہے۔ اس میں کھلبلے کا اندیشہ نہیں۔ ریڈار آگے آگے چلتا ہے اور بروقت اطلاع دیئے جاتا ہے۔"

"اور علم ریمیا کس سے سیکھا؟" شہزاد نے پوچھا۔

"فلیمنگ روڈ پر، چوک برف خانے کے پاس" رعنا نے کہا "ایک موچی بیٹھتا

ہے۔ وہ علم ریمیا کا شہنشاہ ہے۔ میں نے اس کے پاؤں دبا کر یہ علم حاصل کیا۔"

"اور اس موچی کا پتہ تم کو کس نے دیا؟" شہزاد نے پوچھا۔

رعنا نے کہا "تمہیں وہ اماں بلوچن یاد ہے جو ہمارے گھر تھریڈنگ کے لئے آیا کرتی تھی.... اس نے بتایا تھا موچی کا پتہ۔"

"اس نے تو جان لڑا دی" پروفیسر ندیم نے چمک کر کہا "اور یہ مجھے سیف الملوک کی طرح اُٹھا کر یہاں لے آئی۔"

پھر وہ تینوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈال کر بھوری اور گرے زمین پر چلتے رہے اور شہزاد سے اس کے سمیسٹر کی بابت پوچھتے رہے۔ رعنا فکرمند تھی کہ اب وقت کافی ہو گیا ہے اور شہزاد کو امریکا سے واپس آ جانا چاہیے۔ پروفیسر ندیم کہہ رہے تھے کہ اب آخری دُم رہ گئی ہے اس کو گزار کر ہی آنا چاہیے خواہ ایک سمیسٹر اور لگ جائے۔

پروفیسر ندیم اور رعنا چونکہ مہینہ بھر سے یہاں آ جا رہے تھے اس لئے وہ قلارے کے زاویوں، موڑوں، چوراہوں، چھ راہوں اور لپکتی گہرائیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جب بھی آپس میں بات کرتے، اس ستارے کی جغرافیائی صورت کے حوالے سے کرتے۔ شہزاد اُن کی باتیں سن کر ویسے ہی شرمندہ ہوتا جیسے ترقی یافتہ ممالک کے فہمیدہ اور زیرک ایکسپرٹ غریب اور پس ماندہ ملکوں کے حاکموں اور اہلکاروں کو اپنی گفتگو سے شرمندہ کیا کرتے ہیں۔ جو جو باتیں اس کے ستارے کے متعلق پروفیسر ندیم اور رعنا کو معلوم تھیں، اُن میں سے وہ ایک بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن پروفیسر ندیم اور رعنا منگیتر اس کی خفت دُور کرنے کے لئے مہربانہ انداز میں بار بار کہہ رہے تھے کہ "آپ چونکہ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں اس لئے سب باتوں کا معلوم ہونا ضروری نہیں۔ آہستہ آہستہ سب پتہ چل جائے گا۔"

جب شہزاد واپس زمین پر پہنچا تو اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی تین گولیاں رعنا کی بڑی پورٹریٹ پر ماریں اور ساتھ اُونچی آواز میں کہا "کتی، حرام زادی!" پھر اس نے اپنی صدیوں پرانی خاندانی غیرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زور زور سے اپنا سر دیوار سے ٹکرایا اور اُونچے اُونچے "اوئے بے غیرتا! اوئے بے غیرتا!!" کہہ کر زار د

قطار رونے لگا۔

جب تک وہ کرہ ارض پر رہتا، رعنا اور ندیم کو قتل کرنے کے پروگرام بناتا رہتا۔ لیکن جب وہ اپنا پستول لے کر اور زہر کی سرنج بھر کر زمین کے مدار سے باہر نکلتا تو اس کو انتقام اور بدلے اور وینڈیٹا کے سارے داؤ بھول جاتے۔ وہ پروفیسر ندیم اور رعنا کے ساتھ مل کر لمبی لمبی سیروں پر نکل جاتا اور ہر مقام پر اُن کی خوشی اور خوشنودی کے راگ الاپ کر واپس آجاتا۔

زمین پر پہنچ کر پھر انتقام اور بدلے کی آگ میں جلنے لگتا اور جو کچھ اُوپر دیکھ چکا ہوتا، وہ بڑی سکرین پر رنگین فلم بن کر اُبھرتا اور قدم قدم پر اُسے خودکشی کی طرف مائل کرتا۔

یوں تو زمین میں بھی ایک طرح کی کشش موجود تھی اور اس کا سارا نظام اسی کشش سے بندھا تھا لیکن یہ کشش اجرام فلکی کی کشش سے بہت مختلف تھی۔ زمین کی کشش، کشش ثقل تھی اور اس کے اپنے ستارے قلارے کی کشش صیقل تھی۔ کشش ثقل انسان کو انسانوں کے قتل پر آمادہ کرتی تھی اور پھر قتل کرنے پر مجبور بھی کرتی تھی۔ کشش صیقل ہر طرح کے داغ، دھبے، نفرت، کدورت، کام، کرودھ، لوبھ اور استکبار کو دور کرکے دل کو آئینہ سا بنا دیتی تھی۔ اس میں جب بھی اپنی شکل دکھائی دیتی، اچھی دکھائی دیتی اور جب بھی اپنا آپا نظر آتا، پھول پنکھڑی کا مجموعہ نظر آتا۔

یہاں کا نظام اور یہاں کی فضا زمین سے بالکل مختلف تھی۔ گردش خون اور تنفس کا نظام بالکل اور طرح کا تھا۔ بھوک لگتی تو تھی مگر یاد نہیں رہتا تھا کہ بھوک لگی ہے۔ کچھ کھاؤ تو کھایا بھی جاتا تھا لیکن اگر یاد نہ رہے تو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی۔

شہزاد نے پروفیسر ندیم سے پوچھا کہ ”سر آپ تو یہاں کافی آتے جاتے ہیں....“ ”بلکہ ہر روز ہی آتے ہیں“ رعنا نے بات کاٹ کر کہا تو شہزاد نے اُسے فہمائش کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”پروفیسر صاحب ہم دونوں کے بڑے ہیں۔ جب میں اُن سے بات کروں تو تم کو چپ رہنا چاہیے۔“ پروفیسر صاحب نے کہا ”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں“ لیکن رعنا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شہزاد سے معافی مانگی اور کرسٹل

ڈسٹ کے ایک ٹیلے کی طرف دیکھنے لگی۔

شہزاد نے کہا "سر! میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ تو یہاں کافی آتے جاتے ہیں، کیا اس تنہائی میں نفسانی خواہشات اپنا زور نہیں دکھاتیں؟ میں نے تو یہاں آ کر جب بھی دیکھا ہے، نفسانی خواہشات بند سی ہونے لگتی ہیں!"

"بند سی ہونے لگتی ہیں؟" پروفیسر ندیم نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی سر" شہزاد نے سر جھکا کر کہا "جیسے بدن کے اندر اور باہر بے شمار ڈبیاں ہوں... کچھ کھلے منہ کی، کچھ تنگ منہ کی، وہ سب یہاں پہنچتے ہی کٹک کٹک کر کے بند ہونے لگتی ہیں۔ مجھے تو اُن کی آوازیں بھی صاف سنائی دیتی ہیں.... جیسے اُنگلیوں کے پٹاخے نکالنے کی آواز ہو۔ ویسی۔"

پروفیسر ندیم نے ہنس کر کہا "ڈبیاں تو ہماری بھی بند ہو جاتی ہیں لیکن آواز کبھی نہیں سنائی دی کہ بند ہو رہی ہیں۔"

رعنا نے کہا "میری تو ساری کی ساری اسی طرح سے کھلی رہتی ہیں لیکن اُن میں کچھ ہوتا نہیں۔"

"ایسے ہو سکتا ہے سر!" شہزاد نے چونک کر پوچھا "کہ نفسانی خواہشات کی ڈبیاں کھلی رہیں اور اُن کے اندر کچھ نہ ہو؟" پروفیسر ندیم نے کہا "اس ستارے کی ساخت میں اور ساری کجیاں تو ہماری زمین جیسی ہیں لیکن اس میں تکبر اور انانیت کا جزو شامل نہیں ہے۔ اور جس بنتر اور بناوٹ میں استکبار کے اجزا شامل نہ ہوں، وہاں شیطان کا عمل دخل نہیں ہوتا اور وہاں ابلیس کا اغوا ممکن نہیں رہتا۔ اور جو علاقہ شیطان اور اس کے لشکر کی دسترس میں نہ ہو، وہاں خواہشات نفسانی کی ساری ڈبیاں بھی کھل جائیں تو وہ خالی ہی رہتی ہیں۔ اصل میں اُن کو آگ دکھانے والا اور شعلہ بھڑکانے والا شیطان ہی ہوتا ہے۔"

"شیطان کے پاس ایک بہت ہی چھوٹا سا ہتھیار ہوتا ہے.... نظر نہ آنے والا، منا سا ہتھیار.... لیکن بے حد خطرناک اور سو فیصد مہلک!" یہ کہہ کر رعنا رکی اور کافی دیر تک خاموش رہی۔

"کون سا ہتھیار؟" شہزاد نے بے چینی سے پوچھا "کس قسم کا ہتھیار؟"

"بالکل ہی چھوٹا سا، منا سا، میرے اس ناخن کے برابر!" رعنا نے حیرانی سے جواب دیا۔ "لیکن وہ ہوتا کیا ہے؟" شہزاد نے سر جھٹک کر پوچھا تو رعنا مسکرا کر بولی بس ایک لائٹر ہوتا ہے، سگریٹ لائٹر جیسا.... لیکن اس میں پیٹرول یا گیس نہیں ہوتی، لیزر کی لپک ہوتی ہے۔ یہ لپک کوندے کی طرح دور تک بلکہ بہت ہی دور تک پہنچ جاتی ہے اور نارنجی آگ کی باڑھ مار دیتی ہے۔"

پروفیسر ندیم بڑے غور سے رعنا کی بات سن رہا تھا۔

رعنا نے کہا "شیطان جب چاہتا ہے، وہ اپنے تھمب نیل لائٹر سے خواہشات نفسانی کی ڈبیا میں اپنا کوندا پھینکتا ہے اور سارے وجود میں آگ لگا دیتا ہے۔"

"کون سی ڈبیا میں؟" شہزاد نے گھبرا کر پوچھا تو رعنا نے کہا "جب کسی ایک خواہش کی ڈبیا کھلتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری خواہشات کی ڈبیاں بھی آپ سے آپ کھل جاتی ہیں — جونہی شیطان کے لائٹر کا کوندا ایک خواہش کو اگنائٹ کرتا ہے، دوسری ساری ڈبیاں بھی ایک ساتھ بھڑک اٹھتی ہیں: کام، کرودھ، غصہ، شہوت، لالچ، موہ، جاہ، تکبر، اہنکار سب بھڑ بھڑ کر کے ایک ساتھ جلنے لگتے ہیں۔"

پروفیسر ندیم اور شہزاد چوروں کی طرح ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

"لیکن ہمارے یہاں، اسی ستارے میں" رعنا نے کہا "شیطان اور اس کی ذرّیات نہیں ہیں۔ چونکہ ہماری سطح کے اندر کشش ثقل نہیں بلکہ کشش صیقل ہے اس لئے یہاں تکبر اور غرور کا وجود نہیں ہے۔" اور جس مقام پر تکبر اور گھمنڈ نہ ہو، وہاں شیطان کا حکم نہیں چلتا۔"

شہزاد نے کہا "میں تمہاری بات سمجھا نہیں!"

رعنا نے ایک سنجیدہ مقرر کی طرح انگلی اوپر اٹھا کر کہا "وجہ یہ ہے کہ شیطان کا وجود کبر سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اب جس خطے یا منطقے میں غرور، تکبر، گھمنڈ یا ابھیمان نہیں ہو گا وہاں شیطان داخل ہو ہی نہیں سکے گا۔"

اس نے شہزاد کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ پنکھے کی طرح ہلا کر کہا "بھئی جس جس علاقے میں ریل کی پٹڑی ہی موجود نہ ہو، وہاں ٹرین کس طرح سے داخل ہو سکتی ہے اور انجن کس طرح سے شنٹ کر سکتا ہے!"

شہزاد نے رعنا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر پروفیسر ندیم سے کہنے لگا "سوری سر! میں یہاں اور زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا۔ میرا سمیسٹر ختم ہو رہا ہے اور مجھے ابھی بہت ساری اسائن منٹس نمٹانی ہیں۔ میں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا۔"

رعنا نے کہا "ذرا سے تو اور رکو شہزاد!"

شہزاد نے کہا "میں تو ہمیشہ کے لئے یہاں رک جاؤں لیکن پھر میرا بڑا نقصان ہو جائے گا اور اس کی تلافی عمر بھر نہ ہو سکے گی۔ آپ لوگ بیٹھیں، میں پرسوں پھر آجاؤں گا.... اسی وقت، بلکہ اس سے بھی دو گھنٹے پہلے!"

پیشتر اس کے کہ ندیم اور رعنا کچھ اور کہتے، شہزاد شُر کر کے نیچے اُترنے لگا۔

جونہی وہ زمین کے مدار میں داخل ہوا اور اس کے وجود پر کشش ثقل کی کھینچ پڑی تو اُس نے ندیم اور رعنا کو ماں بہن کی گندی گالیاں دینا شروع کر دیں اور تھوک کے بڑے بڑے تھوبے زمین پر گرانے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کرہ ارض کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لمبی سے دھار مارتا ہوا گزر جائے لیکن ابھی اس کے پاس اتنا سٹاک نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دراز سے آٹومیٹک نکالی اور کھڑکی سے باہر تواتر کے ساتھ فائر کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ پشتو، پنجابی اور ہندکو میں اُونچے اُونچے گالیاں نکالنے لگا۔

جب اس کا غصہ قدرے کم ہوا تو اس نے پراپرٹی ڈیلر کو فون کر کے اپنے ستارے کا نام، پتہ، محل وقوع اور رجسٹریشن نمبر دے کر کہا "میں اسے ابھی بیچنا چاہتا ہوں۔ ابھی، اسی وقت۔ کوئی بھی گاہک ہو.... کہیں کا بھی ہو، اس کے ساتھ سودا طے کر لو۔"

رئیل اسٹیٹ کی لڑکی نے پوچھا "آپ کے پاس سوئزرلینڈ کا رجسٹریشن نمبر ہے؟"

شہزاد نے کھٹ کھٹ نمبر اور اس کا کوڈ زبانی بتا دیا۔ لڑکی نے کہا "گاہک تو ضرور ہیں سر پر آج کل ستاروں کی سیل کا ذرا مندا ہے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم

اسے اسی قیمت پر بیچ سکتے ہیں جس پر آپ نے یہ ستارہ خریدا تھا۔"

"ضرور! ضرور!! ضرور!!!" شہزاد نے چلّا کر کہا "اگر اس سے دس ڈالر کم بھی ملیں تو بھی سودا کر لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ حرام زادے جو اس وقت میرے کوکب کی پاکیزہ سطح پر بیٹھے گلچھرے اُڑا رہے ہیں، اُن کو نیا مالک ٹھڈے مار کر باہر نکال دے اور ان خلاف کار متجاوزوں کو دھکے دے کر کشش ثقل کے حوالے کر دے۔"

پھر وہ اُونچے اُونچے رونے لگا اور اس کے رونے میں روئے زمین کا سارا کرب کھچ کر اس کی سسکیوں میں شامل ہو گیا!

بدنی ضرورت

آج جب وہ بابے سے دو روپے کے دہی بھلے اور پچاس پیسے کا کھلا چاٹ مسالہ لینے آئی تو کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کے سامنے ریڑھی پر بابے کی جگہ ایک نوجوان کھڑا تھا جس کا قد درمیانہ، بال گھنگھریالے اور مونچھیں موٹی تھیں۔

اس نے سلور کا کٹورہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا "آج بابا نہیں آیا؟" تو صدیق نے بھلے ڈالتے ہوئے جواب دیا "اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ میں نے اس کا اڈہ خرید لیا ہے۔"

لڑکا پلاسٹک کی گندی پلیٹ میں بھلے اور بوندی لے کر ایک طرف کو ہوگیا تو رضیہ صدیق کے ذرا اور قریب ہو کر پوچھنے لگی "اب بابا کیا کرتا ہے؟"

"ریڑھی لگاتا ہے، اور کیا کرنا ہے اس نے!"

"ریڑھی پر بیچتا کیا ہے لیکن؟" رضیہ نے "لیکن" پر زور دے کر پوچھا تو صدیق نے چہرہ اوپر اٹھا کر غور سے رضیہ کو دیکھا اور اس کی نگاہیں جوان لڑکی کی گردن پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ پھر اس نے جلدی سے گردن کے اردگرد کا علاقہ دیکھ کر جواب دیا "بابا بھی بھلے ہی بیچتا ہے، اور کیا بیچتا ہے، اس نے لیکن وہ اپنی ریڑھی شالامار کے دروازے پر لے گیا ہے۔"

رضیہ کھانسی تو اس کی پھوار کا ایک ابخرہ صدیق کی مونچھوں کے اندر گھس گیا۔ مونچھوں کی جھاڑی میں اس چھوٹے سے خرگوش بچے سے بے نیاز صدیق نے کٹورہ ہاتھ میں لے کر پوچھا "کیا؟"

رضیہ نے کہا "دو روپے کے بھلے اور پچاس پیسے کا کھلا چاٹ مسالہ!"

دو روپے کے بھلے اور چاٹ مسالے کی پڑیا لے کر جب رضیہ بلبوں والے

سائیں کے ڈیرے سے گزری تو اسے وہ بلا جو چھوٹی دیوار پر کھڑے ہو کر اپنی دم جھلاتے ہوئے گندی نظروں سے رضیہ کو دیکھا کرتا تھا، آج کچھ زیادہ برا نہیں لگا۔

اپنے ماے کے آگے وہی بھلے کا کٹورہ رکھتے ہوئے رضیہ نے کہا "ماما! بابا اب وہاں نہیں ہے۔ ایک اور ہی گٹھا سا آدمی وہاں ریڑھی لگائے کھڑا ہے۔ کہہ رہا تھا اس نے بابے سے وہ اڈا خرید لیا ہے۔"

ماے غفور نے کہا "اس کے بھلے اچھے ہیں رضیہ، تو بھی چکھ کے دیکھ۔"

رضیہ کو بڑا دکھ ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ ایک اچھے بھلے نوجوان کو گٹھا بنا دیا جس کا رنگ پیلیا سفید تھا اور جس کے بھلے ماے کو بابے کے بھلوں سے بھی اچھے لگے تھے۔

دوسرے دن وہ اپنی مامی سے پوچھ کر داتا دربار سلام کرنے گئی تو جاتے ہوئے صدیق سے اس کا نام پوچھ کر درگاہ میں داخل ہوئی اور واپسی پر اس کے لیے نیاز کے چھ سات مکھانے لے کر آئی۔

دربار کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دو مکھانے منہ میں ڈالے تو اسے خیال آیا کہ کتنا اچھا ہو اگر وہ یہ نیاز صدیق کو دے کر گھر جائے۔ لیکن دو مکھانے منہ میں ڈالنے کے بعد اس کی مٹھی میں کل پانچ مکھانے رہ گئے تھے، اور پانچ مکھانے کسی کو دیتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے اس نے دونوں مکھانے منہ سے نکال کر اور اپنی اوڑھنی سے پونچھ کر واپس مٹھی میں بھینچ لیے اور جاتے جاتے ساری نیاز صدیق کو دے گئی۔

صدیق نے سارے مکھانے ایک ایک کر کے چوس لیے اور بہت خوش ہوا کہ اس علاقے میں ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو اتنی جلدی واقف بن جاتی ہیں۔ رات کو صدیق کی ماں نے صدیق سے اس کے نئے اڈے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ بس "ہاں ماں" اور "ناں ماں" کر کے ہی رہ گیا۔

کوئی آدھی رات کے وقت صدیق کی آنکھ کھلی تو اس کے سینے میں اس بلا کی ہوک اٹھی کہ وہ اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے رضیہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تو سب کچھ گڈمڈ ہو گیا اور وہ خالی ہاتھ ہو

کر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک وہ اس بات پر پچھتاتا رہا کہ اس نے کیوں وہ اڈا لیا اور کس لیے وہاں ریڑھی لگائی اور کس کارن اس لڑکی سے نیاز لے کر کھائی۔

رضیہ نے سچی سچی ساری بات کریم دفتری کی بیٹی زبیدہ کو بتلا دی کہ داتا دربار کے باہر منٹ کیمرہ فوٹوگرافر کے ساتھ جو نوجوان دہی بھلے بیچتا ہے، اس نے رضیہ کا آرام سکون لوٹ لیا ہے اور اب وہ بھائی رہنا نہیں چاہتی، اس آدمی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے — لیکن جب زبیدہ نے اس آدمی کے گھر کا پتہ پوچھا تو رضیہ نے کہا "مجھے کیا معلوم، میں کوئی اسے جانتی تھوڑا ہوں۔"

اگلے دن جب زبیدہ اور رضیہ دونوں صدیق کی ریڑھی سے بھلے لینے گئیں تو زبیدہ نے ایک زور کا دوہتڑ رضیہ کی کمر میں مار کر کہا "نی در فٹے منہ تیرا! منہ نہ متھا کس کے لیے اپنا محلہ چھوڑ رہی ہے۔"

صدیق سمجھ تو گیا لیکن اس نے کوئی بشارت نہ دی۔ بھلے کٹورے میں ڈال کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے پیسے لینے سے منع کر دیا اور دونوں لڑکیاں ایک دوسری کو پہلوؤں کے کوہلے مارتی واپس چل پڑیں۔

دس پندرہ قدم جا کر رضیہ رکی اور کٹورہ زبیدہ کے ہاتھ میں دے کر بولی "تو چل، میں ابھی آتی ہوں۔" زبیدہ کٹورہ اس کے ہاتھ سے لے کر چلی نہیں، وہیں کھڑی ہو گئی۔

کھمبے کی مدھم روشنی میں زبیدہ نے دیکھا کہ رضیہ صدیق کے پاس جا کر رکی، ہنس کر اسے دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ صدیق نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اپنے ماتھے سے لگائیں اور دیر تک ویسے ہی کھڑا رہا۔ سامنے بانس کے صوفے بنانے والے نے اپنی دکان بند کرتے ہوئے پجاری کو آرتی اتارتے دیکھا لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ شام کے دھوئیں میں، گرد میں ایک کے دو ہونے کو سمجھ کر آگے نکل گیا۔

رات جب رضیہ ضرورت سے زیادہ کھانسی تو اس کی ماں نے آواز دے کر پوچھا "کیا بات ہے رضیہ، اس قدر زیادہ کیوں کھانس رہی ہے؟" تو رضیہ نے کان میں کھچا کھچ انگلی چلا کر کہا "کچھ نہیں ماں، کھرکھری لگ گئی ہے۔"

نیند میں ڈوبتے تھکے ہارے ماے غفور نے کہا "مصری کی روڑی منہ میں رکھ لے، ٹھیک ہو جائے گی۔"

"رکھی ہوئی ہے ماما جی" رضیہ نے اونچی آواز میں جواب دیا، حالانکہ وہ جھوٹ کہہ رہی تھی..... اس کے منہ میں صرف صدیق کا نام تھا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

رضیہ کے سینے میں اچانک ایسی خارش ہونے لگتی تھی کہ اس سے پہلے اس کو اس قسم کا جلیبن کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

وہ حیرانی سے اپنے کندھوں، اپنے سینے اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور اس کی بے چینی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں گال آنسوؤں سے بھیگ چکے ہیں اور جلد میں مرچیں سی لگنے لگی ہیں۔ اس نے اپنے دوپٹے سے منہ رگڑ کر صاف کیا اور چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے سامنے کی چھوٹی دیوار پھلانگ کر صدیق اندر آیا اور چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر سیدھا اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

بڑی دیر تک وہ اس کے دونوں ٹخنے پکڑ کر زمین پر بیٹھا رہا اور سر جھکا کر روتا رہا۔ رضیہ نے اس پاکیزی پر کوئی مزاحمت نہ کی اور چپ چاپ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے اور خواب میں اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا اس لیے وہ سر جھکائے اور پوری آنکھیں کھولے ان ہاتھوں کو دیکھتی رہی جنہوں نے اس کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔

سرمئی رنگ کے اس گہرے خواب میں ڈوبی وہ بڑی دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی اور صبح صادق کے وقت وہ خواب اپنی تعبیر بن کر سامنے آ گیا۔

دونوں اپنی اپنی جگہ سے ایک ساتھ اٹھے اور اپنے اپنے صحن کا دروازہ کھول کر آہستگی کے ساتھ باہر نکل گئے۔ دور دور بجھتی ہوئی روشنیوں کے نیچے کوئی کوئی تانگہ سٹیشن کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کو بھی ایک خالی تانگہ مل گیا اور وہ دونوں اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر سٹیشن پہنچ گئے۔ پشاور سے آنے والی لیٹ گاڑی اب چلنے کے قریب تھی اور انجن کی دھمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا پڑاؤ ساہیوال تھا۔

رضیہ اور صدیق ساہیوال پہنچ گئے اور یہاں صدیق نے دہی بھلے کی ریڑھی

لگانی شروع کر دی۔ ان دونوں کو بس ایک ہی شوق تھا..... دن بھر بھلے بونڈی بنانے کا، شام کو ریڑھی لگانے اور برتن اجالنے کا اور رات کو ایک دوسرے میں گھس کر سونے کا!

عجیب ہے کہ دونوں ایک ہی سانچے میں ڈھلے تھے اور دونوں کو ایک دوسرے کی گردن پر منہ رکھ کر سونے کی عادت تھی۔ رات کو سوتے میں وہ چھوٹے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے ضد کرتے ہوئے اپنا اپنا چہرہ دوسرے کی گردن پر رکھنے کے لیے جھگڑا کرتے تھے اور منمناتے رہتے تھے۔ گو اس جھگڑے میں زیادہ تر رضیہ ہی کامیاب ہوتی لیکن صدیق بھی نیند میں "میں نہیں" "میں نہیں" کہتا ہوا دو تین باریاں لے لیتا تھا۔

ان کی دہی بھلوں کی دکانداری کچھ ایسی شدت سے چلنے لگی تھی کہ اب ان سے دن میں اتنا مال نہیں بنتا تھا جتنی کہ اس کی مانگ تھی۔ پیسے بھی جمع ہونے لگے تھے اور رضیہ کو ساہیوال بھی پسند تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ پانچ مرلے کی چھوٹی سی زمین خرید کر ہمیشہ کے لیے یہاں آباد ہو جائے اور اس کی آگے کی نسل اسی شہر سے چلے۔

جب ایس ایچ او صاحب کے یہاں شام کو باقاعدگی سے دہی بھلوں کی بڑی پلیٹ جانے لگی تو صدیق نے یہ شہر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ رضیہ کو اپنی آئندہ نسل کی چھتر چھاؤں والا شہر چھوڑنا کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔ اس نے تھانے دار صاحب کے لیے پلیٹ تیار کرنے کا سارا ذمہ اپنے سر لے لیا اور صدیق کو اس الجھن سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔

لیکن ایک روز جب تھانے سے تین بڑی پلیٹیں بھجوانے کا حکم آیا تو صدیق بپھر گیا۔ اس نے سپاہی کے سامنے کچھ احمقانہ جملے کہہ دیے تو ہیڈ کانسٹیبل نے صدیق کے پاس آ کر ایک ہاتھ تو اس کے کندھے پر رکھا اور دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر بولا "تھانے دار صاحب نے تمہارا نکاح نامہ منگوایا ہے۔ اصل دینا ہے تو اصل دے دے، فوٹو کاپی جمع کرانی ہے تو وہ کرا دے۔" صدیق نے ہیڈ کانسٹیبل کا ہاتھ جھٹک کر کہا "گھر پڑا ہے۔ ابھی لے کر آتا ہوں اور تیرے صاحب کو بھجواتا ہوں۔ مہربانی!"

ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا تو صدیق نے گھر آ کر رضیہ کو اٹھایا۔ بیسن میں لتھڑے اس

کے ہاتھ دھلوائے اور کھلا گھر اور کھلے برتن چھوڑ کر اسے ساتھ لے کر شاہدرے اپنے دوست جمیل کے پاس آ گیا جس نے اپنی برادری کے لوگوں میں بھدی سی ڈھولک بجوا کر رضیہ اور صدیق کا نکاح پڑھوایا تھا۔

جمیل کے گھر سے اپنا نکاح نامہ لے کر اور اس کی پانچ فوٹو سٹیٹ کاپیاں بنوا کر وہ سیدھا مانسہرہ پہنچ گیا۔ لیکن یہ شہر رضیہ اور صدیق دونوں کو پسند نہ آیا اور تین دن ادھر ادھر کی کلیلیں بھرنے کے بعد وہ منگورہ پہنچ گئے۔

منگورہ کا بازار بڑا پررونق اور گاہکوں سے بھرا بھرا تھا۔ یہاں تکے کباب اور کڑاہی گوشت کی بہت سی دکانیں تھیں جہاں اعلیٰ درجے کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے اور دنبے لٹکا کرتے تھے اور مقامی لوگوں سے زیادہ باہر کے آئے ہوئے ٹورسٹ مشام انگیز باربی کیو سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

صدیق نے کڑاہی گوشت کی سب سے بڑی دکان کے پہلو میں دہی بھلوں کا چھابہ لگا لیا کہ یہاں فوری طور پر ریڑھی حاصل کرنا ذرا مشکل تھا۔

باہر سے آئے ہوئے ٹورسٹوں کے مقابلے میں مقامی لوگوں نے صدیق کے دہی بھلوں پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دی تو انہیں دن میں تین مرتبہ بھلے تیار کرنا پڑتے۔ رضیہ دن بھر تیل کڑکا کر سوکھے بھلے تلتی رہتی اور صدیق اڈہ چھوڑ کر وقفے وقفے سے سٹاک لے جایا کرتا۔ یہاں کا دہی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا مگر صدیق نے دہی، دودھ، سوکھا پاؤڈر اور نشاستہ ملا کر ایک ایسا ملغوبہ تیار کر لیا تھا کہ بہت سے مقامی گاہک بھلا نکال کر باہر پھینک دیتے تھے اور چمچوں سے دہی کھا جاتے تھے۔

رضیہ یہاں بہت خوش تھی کہ آتے ہی دو یوسف زئی لڑکیاں اس کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ان دونوں لڑکیوں نے آٹھویں تک اردو کی وہی کتابیں پڑھی تھیں جو رضیہ بھاٹی کے سکول میں خود بھی پڑھ چکی تھی۔ اتفاق سے دونوں لڑکیوں کے نام بھی ایسے تھے جن کو رضیہ پشتو فلموں میں اچھی طرح سن جان چکی تھی۔ زرینہ عمر میں رضیہ سے بڑی تھی لیکن پشمینہ رضیہ کی ہم عمر تھی۔ پشمینہ کا چہرہ اعلیٰ درجے کے صحت مند ریڈ بلڈ مالٹے جیسا تھا اور اس کی ٹھوڑی کے عین نیچے ننھا سا بھنور تھا جو موسمی کے پیندے میں ہوتا ہے۔ زرینہ اور پشمینہ رضیہ کے کام میں اس کا ہاتھ بھی بٹاتیں اور اسے

روزمرہ استعمال کی چیزوں کے پشتو ناموں سے بھی آگاہ کرتی جاتیں۔

کوئی دو ماہ بعد جب صدیق نے منگورہ سے مادیان جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو رضیہ نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ زرینہ اور پشمینہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ صدیق بے بس ہوگیا اور اسے دنیا میں پہلی مرتبہ رضیہ نامی لڑکی کچھ بری سی لگی۔

بات زرینہ، پشمینہ کی نہیں تھی اور بات رضیہ کی بھی نہیں تھی۔ اصل میں بات کچھ اور ہی تھی.... وہ جو ایک دوسرے کی گردنوں پر چہرے چڑھا چڑھا کر سونے کی عادت تھی، اس میں کمی واقع ہونے لگی تھی۔ دو دفعہ ایسے بھی ہوا کہ کچھ کام کی زیادتی سے اور کچھ صدیق کے دیر سے آنے کی وجہ سے رضیہ بستر پر لیٹ کر سو گئی تو صدیق اس کے قریب پرانے تخت پوش پر کمر سیدھی کرتے کرتے بے ہوش سو گیا اور صبح دونوں جاگے تو دونوں نے کچھ اور ہی سمجھا۔

صدیق کا خیال تھا کہ زرینہ، پشمینہ کے ساتھ بہناپا ہو جانے سے اور تیز رفتار کمائی کی بدولت سونے کے دو کنگن بن جانے سے رضیہ اس سے بے نیاز ہوگئی ہے جبکہ رضیہ کو پکا یقین ہوگیا تھا کہ وزیر آبادی انگریز کی لڑکی کے بار بار اڈے پر آنے سے اور دن میں تین تین مرتبہ دہی بھلے کھانے سے صدیق کی وفاداری تبدیل ہو رہی تھی.... لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ دونوں میں مرد عورت والی ساری خوبیاں موجود تھیں اور دونوں نسل انسانی کو آگے بڑھانے پر پوری طرح سے قادر تھے مگر ان کے درمیان چاہت کے وہ رشتے نہیں رہے تھے جو پہلے ہی روز رضیہ کے دل میں اور دوسرے ہی دن صدیق کے دل میں پیدا ہو کر ان کا سینہ چھلنی کر چکے تھے اور وہ ایک دوسرے کی گرم سانسوں اور شیر گرم بدنوں کے محتاج ہو گئے تھے۔

لیکن آپ تفصیلوں میں جا کر کیا کریں گے اور اس سارے واقعہ کا کھرا کس طرح سے دبا سکیں گے کہ آپ کے پاس وہ علم ہی نہیں جس کی وجہ سے صدیق اور رضیہ میں ایسا شدید نقصان پیدا ہوا جسے کوئی نام دینا مشکل ہے۔

ایک روز صدیق رضیہ کو سوتا چھوڑ کر مادیان چلا گیا اور اس نے وہاں ایک ہوٹل سے رابطہ کر کے ہوٹل کے لیے دہی بھلے بنانے شروع کر دیے۔

اس ہوٹل کے ریستوران میں گاہکوں کو سیٹ ملنا مشکل ہو گئی۔ رضیہ سے اس نے رابطہ توڑا نہیں۔ ہر دوسرے دن آتا رہا اور اس کو ڈھیر سارے پیسے اور خشک میوے دے کر چلا جاتا رہا۔ اس کی اس آنربیل قسم کی بے وفائی سے رضیہ کے دل میں بھی بے وفائی کا جذبہ عود کر آیا اور اس نے کھلے بندوں زرینہ، اور پشمینہ کے تربوروں سے ملنا شروع کر دیا۔ ایک روز وہ زرینہ، پشمینہ گل زمان، اور حسن خان کے ساتھ لاری میں بیٹھ کر مادیان آ گئی۔ سب نے مل کر صدیق کے ہوٹل میں کھانا کھایا، اس سے گپ بازی کی اور شام کو واپس منگورہ چلے گئے۔

صدیق کو رضیہ کا یہ رویہ تھوڑا سا برا لگا لیکن زیادہ نہیں۔ وہ اسی طرح سے آتا رہا جاتا رہا اور باقاعدگی سے رضیہ کو پیسے دیتا رہا۔ لیکن اس دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا.... عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ کھانا پینا بھی تو ہوتا ہے۔ اکٹھے مل بیٹھنا بھی تو ہوتا ہے۔ بااعتبازی بھی تو ایک چیز ہے۔ صبح کے بھولے کا شام کو گھر آ جانا بھی تو خوشی عطا کرتا ہے۔ خیال کی گائیکی کے بعد ترانہ بھی تو لطف دیتا ہے۔ اچھے کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر پان لینا بھی تو ماتھے کو معطر کر دیتا ہے۔ محبوب کے پاؤں میں بیٹھی ہوئی بلی کا اپنے بلونگڑے کو اون کے گولے سے کھیلتے دیکھنا بھی تو سکھ ساگر کا بھید عطا کر دیتا ہے.... اس دنیا میں صرف پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں۔ رضیہ کے ذہن میں یہ خیال میلے کے پرانے پنگھوڑے کی طرح رنگ برنگی آوازیں دیتا گھومتا رہا۔ محبت تو اس کے دل میں بھی باقی نہ رہی تھی، صرف ایک غصہ تھا جو اس کے وجود کی کچی دیوار پھلانگ کر اندر آ گیا تھا اور وہاں کسی کو نہ پا کر بڑھکیں مارنے لگا تھا۔

رضیہ نے حسن خان کے پستول سے تین فائر کر کے صدیق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا اور خود تھانے چلی گئی۔ اس نے اخبار میں کئی مرتبہ یہ پڑھا تھا کہ قتل کرنے کے بعد قاتل خود ہی آلہ قتل لے کر تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس کو صبح سویرے منگورہ کے تھانے چلے جانا اچھا لگا!!

لیکن تھانے دار صاحب کو اپنی مہینہ بھر کی تفتیش سے بھی نہ تو قتل کا محرک ملا اور نہ ہی کوئی ایسی وجہ نظر آئی جس نے رضیہ کو اپنے من پسند شوہر کے قتل پر آمادہ

کر دیا تھا۔ انہوں نے بلاوجہ گل زمان اور حسن خان کو پابند حاضری کر کے شامل تفتیش کیا ہوا تھا۔ پنجاب پولیس کی مدد سے تھانے دار صاحب نے رضیہ کے ماموں اور مامی کو بھی دو مرتبہ حراست میں لے کر منگورہ منگوا بھیجا تھا لیکن اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہو سکا تھا۔

حوالات میں بند رضیہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ ایک ہی بات کہتی تھی کہ پہلے صدیق مجھے پسند تھا، پھر ناپسند ہو گیا۔ ناپسندیدہ چیز کے ساتھ آدمی کب تک اور کس طرح سے زندگی گزار سکتا ہے! میں نے اس کو اپنی راہ سے الگ کر دیا لیکن میں یہ نہیں کہوں گی کہ وہ برا آدمی تھا۔

تھانے دار صاحب نے پشاور سے اپنے استاد ڈی ایس پی کرم داد خان کو بھی بلا کر موقع واردات کا معائنہ کروایا اور رضیہ سے ملاقات کروائی لیکن وہ بھی اس نتیجے پر نہ پہنچ سکے کہ رضیہ کے دل میں اچانک نفرت کے جذبات کیوں پیدا ہو گئے اور اس نے بغیر کسی تحریک کے اتنا بڑا اقدام کس طرح سے کر لیا۔

اصل میں تھانے والوں کے پاس وہ علم ہی نہیں تھا جس کی بنیاد پر رضیہ سے یہ فعل سرزد ہوا تھا۔ نہ رضیہ کے ملا اور مامی کو اس بات کا پتہ تھا۔ نہ ہی بے چارے گل زمان اور حسن خان کو یہ اندازہ تھا کہ رضیہ آگے چل کر یہ فعل کرے گی اور ان کو مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔ خود رضیہ کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جس سینے پر وہ ماتھا رکھ کر سوتی رہی ہے، اس پر گولیاں چلا دے گی۔

جس روز پہلی مرتبہ رضیہ سلور کا کٹورہ لے کر صدیق کی ریڑھی پر دہی بھلے لینے آئی تھی تو اس کو صدیق میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، لیکن جب اس نے اپنا کٹورہ صدیق کی طرف بڑھا کر کہا "دو روپے کے بھلے اور پچاس پیسے کا کھلا چاٹ مسالہ" تو اسے ہلکی سی کھانسی آ گئی۔ رضیہ کھانسی تو اس کی پھوار کا ایک ابخرہ صدیق کی مونچھوں کے اندر گھس گیا۔ اس ابخرے میں پرانی برنکائٹس کے جراثیم تھے جو اس کی مونچھوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے سانس کے راستے صدیق کے پھیپھڑوں میں پہنچ گئے۔ وہاں پہلے سے تپ دق کے Mycohteaerium Tuberculosis جراثیم موجود تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے گھل مل گئے اور جب رضیہ کے نیو موکوکس جراثیموں

نے صدیق کے پھیپھڑوں کو اپنے لیے ایک صحت افزا مقام پایا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ دیکھتے دیکھتے ہزاروں لاکھوں کی کثرت میں تبدیل ہوگئے۔ تپ دق کے جراثیموں نے ان کے لیے اپنی پرانی بستیاں خالی کر دیں اور ان کے درمیان اور کئی قسم کے متعلقہ بیماریاں پیدا کرنے والے مائیکرو آرگینزم پیدا ہوگئے۔ جس روز رضیہ نے داتا دربار سے کھانے کی نیاز لے کر صدیق کو دی تھی اور وہ سارے کھانے چوس کر بہت خوش ہوا تھا تو اسی وقت اس کے اندر پیتھوجینز کی ایک فوج ظفرموج تیار ہوگئی تھی جس میں اس کے پرانے دق کے جراثیموں کے علاوہ رضیہ کے کرانک برنکائٹس کے جرثومے پیرا آرتھرائٹس Ottis media کو بھی انگیخت کر رہے تھے۔

جس روز کریم دفتری کی بیٹی زبیدہ کو ساتھ لے جا کر رضیہ نے دہی بھلوں والا صدیق دکھایا اور واپسی پر اپنی دونوں کلائیاں شام کے دھوئیں میں صدیق کے ماتھے اور ہونٹوں کے حوالے کر دیں تو رضیہ کے بہت سارے پرانے جراثیم اپنے نئے دوستوں اور نئے ہم مشرب جراثیموں کو ساتھ لے کر واپس رضیہ کے ذخیرے اور سانس کی نالی میں آ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ آنے والے مہمانوں کی جی بھر کے خدمت کی اور انہیں رضیہ کے سارے بدن کی سیر کرائی۔ خون میں، گوشت میں، لنف میٹر میں، رگ و پے میں.... ہر مقام اور ہر جگہ انہیں بسایا اور ان کی تازہ بستیاں آباد کیں۔ جراثیموں کی آپس کی محبت اور بے لوث اور پرخلوص تعلق اور کہیں کہیں گوت مختلف ہونے کے باوجود مگر ایک ہی ذات کے ہونے کی وجہ سے ان کی آپس کی رشتہ داریاں ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوئیں کہ رضیہ اور صدیق کے بدن ان کے لیے میکے اور سسرال بن گئے، اور وہ اپنے اپنے میکے لیے تڑپنے پھڑکنے لگے۔

اس تڑپ نے اور پھڑک نے رضیہ اور صدیق کو زیادہ دیر تک الگ الگ نہیں رہنے دیا اور وہ ایک صبح پشاور سے آنے والی لیٹ گاڑی پکڑ کر ساہیوال پہنچ گئے اور ایک دوسرے کی گردنوں کے ساتھ منہ گھسیڑ گھسوڑ کے سونے لگے۔ سانس کی گزر گاہیں ذرا دیر کے لیے بھی ایک دوسری سے دور ہوتیں تو آنے جانے والے جراثیم اپنے راستوں میں دوری دیکھ کر دونوں کے بدنوں میں ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور ہر رگ و ریشہ کے اندر احتجاجی جلسے جلوس شروع ہو جاتے۔ کچھ صحت مند نوجوان اور

بیکٹیریالوجی کے علم سے آشنا جراثیم فوٹوجینز اکٹھے کرکے شریانوں کے ہر چوراہے پر ان کے ناٹز جانے لگتے۔ رضیہ اور صدیق گھبرا کر پھر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے اور جراثیموں کے درمیان آنے جانے کا آزاد سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ دراصل دو بدنوں کے اندر رہنے والے کرانک جراثیموں کے درمیان محبت اور یگانگت کا ایسا اٹوٹ رشتہ پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے رضیہ اور صدیق ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکتے تھے۔ ان کے درمیان محبت کی مضبوط ڈوری اور عشق کا سچا رشتہ بس یہی جراثیم تھے جو ارتباط باہمی کی بدولت ایک دوسرے کے ہم حال ہوگئے تھے۔ جس طرح مغلوں اور راجپوتوں کے درمیان پیار محبت کا تو کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ ہی ہم حالی اور ہم خیالی کا کوئی تعلق تھا لیکن نظریہ ضرورت کے تحت وہ ایک دوسرے سے ایسے شیر و شکر ہوگئے تھے کہ ان کی اولادیں تک مشترک ہو گئی تھیں اسی طرح دق اور مزمن برنکائٹس کے جراثیموں نے آپس میں گھل مل کر دونوں بدنوں میں ایک جیسی بستیاں بسالی تھیں اور انھوں نے ہر طرح کے اختلافات کو بھلا کر باہمی اتفاق کو نشان منزل بنا لیا تھا اور یہ انہی کی یگانگت اور موافقت تھی جس نے رضیہ اور صدیق کو سارس کے جوڑے سماں ایک دوسرے کے شانتی سروپ پنکھ بنا دیا تھا۔

لیکن ظالم زمانہ کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ جب رضیہ اور صدیق کو سوات میں تین مہینے سے اوپر کا عرصہ بیت گیا تو صحت افزا مقام کی ہواؤں نے اور کونی فرقسم کے درختوں کے آکسیجن بردار سانسوں نے مل کر رضیہ اور صدیق کے جسموں کے درمیان تیز دھار تلوار رکھ دی۔ پہاڑ کی فضا نے اور منگورہ سینی ٹوریَم جیسے ماحول نے صدیق کے پھیپھڑوں میں دق کے جراثیموں کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ان کی اٹھارہ انیس سالہ پرانی ہستی بستی بستیاں اجڑنے لگیں اور جراثیموں کے گھرانوں کے گھرانے تباہ و برباد ہونے لگے۔ ان تاخت و تاراج ہونے والی سلطنتوں میں پھیپھڑوں کے لذیذ ماحول کے آس پاس ان نئے آباد کار جراثیموں کی آبادیاں بھی تھیں جو رضیہ کے بدن سے نکل کر اپنے انصار بھائیوں کی محبت میں صدیق کے اندر آباد ہوگئے تھے۔ لیکن اس بلائے ناگہانی سے گھبرا کر اور صدیق کے بدن میں موت کو ایسا ارزاں دیکھ کر وہ واپس اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت کرنے لگے۔ رضیہ کی کھانسی اور سینے کے درد میں اضافہ ہوگیا تو اس نے درد بھری نگاہوں سے صدیق کی طرف دیکھا۔ جوں

جوں وہ صدیق کی طرف بڑھتی، اس کے اپنے سالہا سال پرانے جرثومے اس پیش قدمی کے خلاف پوری طاقت استعمال کرتے اور اندر ہی اندر بغاوت کرکے رضیہ کا من پھیر دیتے۔

ادھر صدیق کے سسٹم میں ایک ایسا جراثیم کش مادہ بننے لگا تھا جس نے اپنے اردگرد کے سارے ماحول پر اک germicide دھند کا تنبو تان دیا تھا۔ رضیہ کے اندر کا کوئی شوخ و چنچل جرثومہ جب پرانی چترائی میں ڈوبا ہوا صدیق کے بدن کے پاس پہنچتا تو جسم میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ بھسم ہو جاتا۔

اور یہ صرف صدیق ہی کے جسم کا قصور تھا جس میں اچانک ایسی تبدیلی پیدا ہو جانے سے رضیہ کا بدن اس کا دشمن بن گیا تھا۔ وہ Bacterial Synergism جو بیکٹیریا کے مختلف خاندانوں کے درمیان بڑی سرعت کے ساتھ پیدا ہو رہی تھی اور جس نے دونوں بدنوں کے اندر اپنے ردعمل سے بھائی بندی اور خویش پروری کی مدھ بھری مدہوشی پیدا کر رکھی تھی وہ صدیق کے بدن کی غداری اور سرکشی سے بیکٹیریا کشی کا قبرستان بن گیا۔

جب بدن کے اندر جراثیموں میں ہی دوسرے بدن کے جراثیموں اور بیکٹیریوں کا احترام نہ رہا اور ان کے درمیان آمدورفت اور آت جات نہ رہی تو پھر جسموں نے خاک ایک دوسرے سے لپٹنا اور ہم بغل ہونا ہے۔ گلے لگنے کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں اور ساتھ رہنے کے پس پردہ کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ جب کوئی باعث نہ رہا، کوئی موجب نہ رہا تو پھر کیسی یاری اور کیسی سنگت!

اب رضیہ اور صدیق کے بدنوں کے درمیان وہ پہلے والی گھما گھمیاں، آوا جادیاں، ہنگامہ خیزیاں اور ریشہ دوانیاں باقی نہیں رہی تھیں۔ بیمار محبت کے مریض کچے دھاگوں کو پہاڑوں، دریاؤں، چشموں اور ندی نالوں کی صحت افزا ہواؤں نے کاٹ کے رکھ دیا تھا اور دو محبت کرنے والے بدنوں کے درمیان قدر مشترک کا ایک بھی رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔

اس ظلم، بے وفائی، ناقدری، حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف تین فائر ہوئے اور بے بس اور بے اختیار رضیہ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔

بولتا بندر

مجھے سن اور مہینہ تو یاد نہیں البتہ یہ اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا اور ساری کلڈنہ روڈ دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ موسم کی گرمی کو کچھ پہاڑ کی اوٹ نے، کچھ چیڑھ کے گرانڈیل درختوں نے اور کچھ درختوں کے تنوں پر اگتی ہوئی اور جمتی ہوئی کائی نے اور بہت کچھ اس دھند نے کاٹ کر اور چاٹ کر خورسند و خوش گوار کر دیا تھا۔

آج دفتر بند تھا۔ چھٹی کا دن، فرصت کا سماں اور لمبی سیر کا موڈ تھا۔ ہم ہلکے ہلکے گرم کپڑے پہنے اپنی اپنی چھڑی گھماتے دھند آلود تنفس سے لطف اندوز ہوتے جھیکا گلی کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یوسف ظفر اور میں اونچے گلے والے سوئٹر پہنے تھے جبکہ مختار صدیقی گرے فلیلن سوٹ میں ملبوس تھا۔ استاد اپنی اس طویل نظم کے بند سنا رہا تھا جو ابھی پچھلی رات اس پر وارد ہوئی تھی اور منشی مختار صدیقی لن یو تانگ کی اس کتاب کے پیرے سنا رہا تھا جو وہ زبانی ترجمہ کر کے مبشر کو لکھوایا کرتا تھا۔ دونوں اپنے اپنے فن میں بہت اونچے جا رہے تھے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس وقت میں کچھ زیادہ معتبر نہیں ہوا تھا البتہ میرا طبلہ بجنے ضرور لگا تھا اور اس کی بڑھت میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ محمود نظامی کو یقین تھا کہ بہت جلد میں بھی اپنے سینئر ساتھیوں کے ساتھ اسی طرح بھاگنے لگوں گا جس طرح گدھا گاڑی کے ساتھ زیر تربیت چھوٹا گدھا بھاگا کرتا ہے۔

جب ہم شریفانہ اٹھکیلیاں کرتے اور ایک دوسرے پر مہذب آوازے کستے سڑک کے آخر پر دائیں گھومنے لگے تو استاد یوسف ظفر نے کہا "کیوں نہ دائیں کے

جانے بائیں گھوم جائیں اور خراماں خراماں اس سڑک پر اتر جائیں جو باڑیاں جاتی ہے!"

"باڑیاں!" مختار صدیقی نے حیرانی سے کہا "پیدل؟"

"جی ہاں پیدل" استاد یوسف ظفر نے جواب دیا "آن فٹ"

"بغیر چھتریوں کے؟" منشی مختار صدیقی نے کہا۔

"جی ہاں بغیر چھاتے کے۔" استاد ظفر نے چھتری کی تانیث کو چھاتے میں بدل دیا تو مختار صدیقی نے کہا "اتنی دور جانے کا فائدہ؟"

میں نے کہا "منشی! چھٹی کا دن ہے' موسم خوش گوار ہے ——"

"جیا بے قرار ہے" استاد نے میری بات کاٹ کر کہا "چھٹی کا تیہار ہے۔ بالم کی پکار ہے۔ جھجکتی جھجکتی آ جا نا!!"

مختار صدیقی نے اپنی چھڑی پر ہلکے سے بدن کا بوجھ ڈال کر کہا "دیکھ لو بھئی اور اچھی طرح سوچ لو' اگر بارش شروع ہو گئی تو راستے میں کوئی شیلٹر نہیں ملے گا۔"

استاد نے کہا "کوئی پروا نہیں' نہ ہم بدلتے موسموں سے ڈرتے ہیں نہ شیلٹروں کی دریوزہ گری کرتے ہیں۔ آندھی ہو یا بارش' طوفان ہو یا ابر سیہ مست —— ہم اپنی راہوں میں خود چراغاں کرتے ہیں اور اپنے دیے آپ جلاتے ہیں۔"

منشی مختار صدیقی کے منہ سے احتجاج کے باوجود ہم باڑیاں والی سڑک پر گھوم گئے۔ چند قدم آگے جا کر بڑے پتھروں کے پاس جب بارش کی موٹی موٹی بوندوں نے ہمارا سواگت کیا تو مختار صدیقی نے کہا "میں نے کیا بکواس کی تھی!"

یوسف ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا "آپ نے بالکل ٹھیک بکواس کی تھی۔ اب آگے چلیے۔ وہ سامنے کچھ بزرگ قسم کی بوندیں بار لے کر ہمارا انتظار کر رہی ہیں' ان کا دل توڑنا مناسب نہیں —— تشریف لے چلیے۔"

لیکن جب ہم ان بڑی بوندوں کے علاقے میں گئے تو وہ ہم پر برسی نہیں' ویسے ہی فضا میں لٹکتی رہیں۔ آگے موسم کچھ بہتر ہو گیا تھا لیکن دھند کی دبازت بڑھ گئی تھی۔ یوسف ظفر نے کہا "مزے مزے سے چلتے ہوئے ہم ٹھیک ساڑھے بارہ بجے باڑیاں پہنچ جائیں گے۔ ایزد مند کھانا کھانے' چائے پینے اور سگریٹ پھونکنے کے بعد ہم پورے

دو بجے یہاں سے چل دیں گے اور شام سے بہت پہلے واپس ہوٹل پہنچ جائیں گے۔"

اس وقت مری کے اس شارٹ ویو ریڈیو سٹیشن پر ہم چار قلم کار کام کرتے تھے۔ میں ان سب میں جونیئر تھا اور ممتاز مفتی ہم سب سے سینئر سکرپٹ رائٹر تھا۔ وہ چونکہ ہفتے کے روز چھٹی کرتا تھا اس لیے آج اتوار کے دن وہ اپنی ٹرانسمشن فیڈ کر رہا تھا اور ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر اس کے بغیر ادھورا تھا اور اس لمبے سفر پر ادھورا ہی چلا جا رہا تھا۔ اگر کہیں ہمارے درمیان مختار صدیقی کے وسیع مطالعے کا سہارا نہ ہوتا تو ہم اپنے ہوٹل کے گرد تالابوں کا چکر لگا کر واپس کمرے میں پہنچ چکے ہوتے لیکن مختار صدیقی بتا رہا تھا کہ..... کوہ مری گزٹیئر میں لکھا ہے کہ 1880ء میں باڑیاں کے گرد گیدڑوں کی تعداد میں ایسا اضافہ ہوگیا کہ یہاں کی انسانی آبادی کو ان سے خطرہ لاحق ہوگیا۔ گیدڑ رات کے وقت راجوں کی فصلیں تباہ کرنے میں مصروف رہتے اور دن کو ان کے بے کواڑ گھروں میں گھس کبڑے ٹوکروں سے ان کی مرغیاں نکال کر لے جاتے۔

کرنل مارک لکھتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ بڑے محنتی، کارکش اور بہادر تھے مگر گیدڑوں سے ڈرنے لگے تھے۔ اگر کسی مخلوق کی آبادی اس کی ہم آباد مخلوق سے کثیر ہو جائے تو دوسری مخلوق کتنی بھی بہادر کیوں نہ ہو، کثیر آبادی والی مخلوق کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔

گورنر پنجاب نے راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر کو حکم بھیجا کہ ایریا ہیڈکوارٹر سے لال کرتی پلٹن کے عمدہ نشانچی منتخب کرکے انہیں باڑیاں روانہ کر دیا جائے۔ وہ ٹکڑی گولی بارود کا حساب رکھے بغیر اندھادھند گیدڑوں کو نشانہ بنائے اور ایک مہینے کے اندر اندر گیدڑوں کی نفری میں کمی کی رپورٹ ڈپٹی کمشنر کے ذریعے گورنر صاحب کو روانہ کرے اور ساتھ ہی اگلے مہینوں کا تخمینہ تیار کر کے بتائے کہ کتنے اسلحے اور کتنے جوانوں کی مزید ضرورت ہے۔

منشی نے بتایا کہ رپورٹ کے مطابق پورے چھ مہینے اس علاقے میں گیدڑوں کی چاند ماری ہوتی رہی لیکن ان کی تعداد میں کماحقہ کمی واقع نہ ہوئی۔ بات یہ تھی کہ کرنل مارک کی بیوی لیڈی مارک جانوروں سے بے انتہا محبت کرتی تھیں اور لندن کی

انجمن انسداد بے رحمی کی بہت پرانی کارکن تھیں۔ ان کو جب پہلے ہی دن گیدڑوں کے قتل عام کا علم ہوا تو انہوں نے ساری پلٹن کو اپنے بنگلے پر بلوا کر حکم دیا کہ خبردار جو تم نے ایک گیدڑ بھی مارا یا زخمی کیا۔ یہ خداوند پاک کی مخلوق ہے اور بالکل ہماری تمہاری طرح سے زندگی بسر کرتی ہے۔ تم ان کو مارو گے تو دوزخ میں جاؤ گے اور ساری عمر آگ میں جلو گے۔

سپاہی لیڈی صاحبہ کی یہ بات سن کر سکتے میں آ گئے اور پریشان ہو کر پوچھنے لگے کہ اگر کیپٹن صاحب نے ان سے پوچھا کہ ایمونیشن کیوں ختم نہیں ہوا تو وہ کیا جواب دیں گے۔

لیڈی مارک نے کہا "تم اوپر نیچے، دائیں بائیں ہوا میں گولیاں چلاتے رہا کرو اور اونچے اونچے للکارتے رہا کرو، تمہارا ایمونیشن خود ہی ختم ہوتا رہے گا۔ پھر میں کیپٹن کو بھی بنگلے پر بلوا کر صاحب سے حکم کروا دوں گی، وہ تم کو نہیں پوچھے گا۔"

یہ کہہ کر لیڈی صاحبہ نے ہر سپاہی کو چاندی کے دو دو روپے نذرانے کے طور پر دیے اور یوں مری کے علاقے میں پہلی مرتبہ رشوت کی بنا پڑی۔

جب میں نے مختار صدیقی سے ایسی بھرپور تفصیلات کے مآخذ اور مصادر کی بابت پوچھا تو اس نے جھڑک کر کہا "یہ چیزیں گہرے اور مسلسل مطالعے کے بعد حاصل ہوتی ہیں.... ایسے نہیں، تم لوگوں کی طرح سے کہ پھٹی جیب میں ڈیڑھ روپے کا فاؤنٹین پن لگا کر سکرپٹ رائٹری کرنے نکل پڑے۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔"

یوسف ظفر نے کہا "گزٹیئر کے عمیق مطالعے سے ہندوستان کا سارا ماضی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے.... اپنی ایک ایک تفصیل اور ٹھیک ٹھیک شرح اور کیفیت کے ساتھ۔ لیکن تم لوگوں نے گزٹیئر کو بس ایسے ہی سرسری طور پر دیکھ کر چھوڑ دیا ہوگا۔"

میں نے سول ملٹری گزٹ تو کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن گزٹیئر کا نام پہلی مرتبہ سنا تھا، اس لیے خاموش ہوگیا۔

مختار صدیقی نے کہا "جب ایک طویل مدت گزرنے کے بعد بھی گیدڑوں کی تعداد میں کمی نہ ہوئی اور کسانوں کا ایک وفد ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کی خدمت میں حاضر

ہو کر عرض گزار ہوا تو اوپر نیچے ہلچل مچ گئی۔ کرنل مارک نے آ کر اپنی بیوی سے شکایت کی کہ اس کی حیوان دوستی کے قصے اب دور دور تک پہنچ گئے ہیں اور وہ وقت بہت قریب آ گیا ہے جب کرنل صاحب کو سرکاری طور پر طلب کر کے ان سے محکمانہ طور پر استفسار کیا جائے گا کہ گیدڑ تلفی میں ان کی بیگم ایک رخنہ بن کر گیدڑوں کی آبادی میں اضافہ کا موجب بن رہی ہیں تو میں کیا جواب دوں گا۔

اس پر لیڈی مارک نے کہا "تم خاطر جمع رکھو، میں نے گیدڑوں کی آبادی کم کرنے کی ایک رحم دلانہ ترکیب سوچ لی ہے۔ نہ ان کی جانوں پر عذاب آئے گا نہ تمہاری جواب طلبی ہوگی۔ سب معاملہ خیریت سے طے ہو جائے گا۔"

یوسف ظفر اور میں اس قصے کو بڑے غور سے اور نہایت دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے اور مختار صدیقی کے سوا ہم دونوں ہی لیڈی مارک سے قطعی طور پر ناآشنا تھے حالانکہ استاد یوسف ظفر گزیٹیر وغیرہ پڑھتا رہتا تھا۔

"اگلے ہی روز" مختار صدیقی نے کہنا شروع کیا "لیڈی مارک نے خیرا گلی سے کیپٹن ڈیوڈ کو بلوا بھیجا۔ کیپٹن ڈیوڈ خیرا گلی کی خچر کور کا وٹرنری ڈاکٹر تھا اور تازہ تازہ لیور پول سے آیا تھا۔

لیڈی مارک نے کیپٹن ڈیوڈ کو اپنی سکیم بتائی تو وہ سوچ میں ڈوب گیا اور پھر سر اٹھا کر بولا "ہم نے یہ علم کتابوں میں تو نہیں پڑھا لیکن چونکہ آپ فرماتی ہیں تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔ پھر آپ ایک کرنل کی وائف ہیں اور برٹش آرمی میں ہر آرمی آفیسر رائٹ ہوتا ہے اور ہر آرمی آفیسر کی بیوی رائٹ ہوتی ہے۔ اس لیے میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا، اور جلد کروں گا۔"

"چنانچہ" منشی مختار صدیقی نے سر ہلا کر کہا "کیپٹن ڈیوڈ کو سرکاری طور پر خیرا گلی سے باڑیاں شفٹ کر لیا گیا اور اس نے گیدڑوں کی فیملی پلاننگ شروع کر دی۔"

میں نے استاد کی طرف اور استاد نے میری طرف غور سے دیکھا۔ منشی نے کہا "رات کو شیرے کے پرانے کنستروں کے پاس تانت کے کمانچے والے پھندے لگا کر گیدڑوں کو پکڑ لیا جاتا۔ سامنے تیز الاؤ کی روشنی میں لے جا کر گیدڑنیوں کو تو چھوڑ دیا جاتا مگر گیدڑوں کو جھپاک سے لٹا کر انہیں آختہ کر کے ان کی نسل بندی کر دی جاتی۔

پھر تین گھنٹے کا ریسٹ دینے کے بعد ان گیدڑوں کو بھی چھوڑ دیا جاتا۔"

میں نے کہا "منشی! یہ سب باتیں گزٹیئروں میں لکھی ہیں؟"

"خالی گزٹیئروں سے ہی سب کچھ نہیں مل جاتا" اس نے جھڑک کر کہا "اس کے لیے اور بہت سا مطالعہ بھی کرنا پڑتا ہے۔"

استاد یوسف ظفر نے کہا "پھر کیا ہوا؟" تو منشی نے کہا "ہونا کیا تھا، تین مہینے کی قلیل مدت میں سب گیدڑ نس بند ہو گئے اور ان کی آبادی میں تیزی سے کمی ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے نئے بچے پیدا ہونا بند ہو گئے اور بڑے گیدڑ اور گیدڑنیاں فوت ہوگئیں۔ کسانوں نے اس خوشی میں قرب و جوار کے سارے پہاڑوں پر میلے منعقد کیے جو جمعرات سے شروع ہو کر اگلی جمعرات تک جاری رہے۔ لیڈی مارک کو لندن، برمنگھم، برسٹل، گلاسگو، ایڈنبرا، سرے اور مانچسٹر سے حیوان دوست انجمنوں نے سات شیلڈیں بھجوائیں اور گیدڑ تلفی کی مزاحمت میں سر دھڑ کی بازی لگانے پر ان کا نام نوبل پرائز برائے امن کے لیے روانہ کیا۔"

میں نے کہا "پھر؟"

منشی مختار صدیقی نے میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اوئے موٹے آدمی! کچھ نتیجہ اپنے بھیجے سے بھی تو نکال لیا کرو۔"

"میرا بھیجا ایسا قابل اعتماد نہیں ناں" میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا "اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

منشی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اقتصادیات کے پروفیسر کا چہرہ بنا کر کہا "تاریخ کی پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ برصغیر کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جہاں خاندانی منصوبہ بندی کا اس قدر کامیاب تجربہ کیا گیا۔"

ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ بارش کے ایک ریلے نے ہمیں دونوں طرف سے گھیر لیا۔ نہ آگے جانے کی راہ رہی نہ پیچھے پلٹنے کا راستہ۔ مختار صدیقی نے قدرے غصے سے کہا "اب بتاؤ احمقو، تم سے کس نے اس راستے پر آنے کے لیے بولا تھا؟"

یوسف ظفر نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا "ادھر آجاؤ منشی، ادھر۔ یہ علاقہ بوچھاڑ

سے باہر ہے۔"

واقعی وہاں ایک تنگ سے پہاڑی راستے کا درہ تھا جہاں بارش نہیں ہو رہی تھی۔ یہ راستہ اچھا کھلا سا جیپ ٹریک تھا لیکن ذرا سا آگے جا کر اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ اس میں سے ایک موٹا آدمی بمشکل تمام گزر سکتا تھا۔ اس کے بعد کا اندھیرا بتاتا تھا کہ آگے کوئی جگہ نہیں کہ یہاں سے نشستہ پہاڑ کی پیٹھ شروع ہو گئی ہے۔

جیپ ٹریک بھی آگے بارہ دری جیسے ایک صحن میں کھل کر پھر اپنے سائز کا ہو کر آگے کو نکل جاتا تھا۔ اس محفوظ صحن میں ترائی کے ایک چھوٹے سے جنگل کی سی کیفیت تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نہ کوئی اس جنگلیا میں پہلے کبھی داخل ہوا اور نہ آئندہ اس کی امید تھی۔ ہم تینوں ان مانے ڈرپوک سیاح اس میں بہ امر مجبوری داخل ہوگئے تھے اور جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان کھڑے سوچ رہے تھے کہ آگے جا کر پھر لوٹیں یا ابھی سے لوٹ جائیں کیونکہ لوٹنا تو ہر حال میں تھا کہ آگے جانے والا راستہ اندھیرے میں تبدیل ہوگیا تھا۔

یہ صحن نما گھیراؤ تقریباً پینتیس لاکھ سال پرانا تھا اور یہاں کسی زمانے میں کوئی عبادت کدہ رہ چکا تھا۔ اس کے اندر موٹے تنے کے چھوٹے قد کے درخت تھے اور پتھروں سے ایسی بیلیں برآمد تھیں جن کے پتے گلو کی بیلوں جیسے تھے اور جن پر کیسری رنگ کے پھول مدھری جسامت کے تھے۔ اس بڑے سائز کی کھو کے ایک کونے میں نئی پرانی بیلوں کی بھرمار تھی اور اس بھرمار کے نیچے کچھ زندگی کے سے آثار نمایاں تھے۔

استاد یوسف ظفر نے کہا "آگے چلو، یہ راستہ ہم کو پہاڑ کی جھری میں سے نکال کر بیک پر لے آئے گا اور کسی پہاڑی پگڈنڈی پر ڈال کر پھر بڑی سڑک سے ملا دے گا۔"

پیشتر اس کے کہ ہم میں سے کوئی جواب دیتا، نئی پرانی بیلوں کی بھرمار کے اندر سے آواز آئی "محترم آگے کوئی راستہ نہیں۔ آگے صرف ایک طویل گپھا ہے جس سے کوئی پگڈنڈی نہیں نکلتی۔ یہ اندھی گپھا صدیوں سے اسی طرح بند ہے اور اس کے اندر کچھ اور قسم کی مخلوق آباد ہے۔"

ہم نے خوف اور تحیر کے ملے جلے جذبات سے بیلوں کے اندر نظر دوڑا کر

دیکھا تو ہمیں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ کچھ عجیب اندھیرے اجالے کا سا سماں تھا۔ بیلوں کے چھپر تلے ایک اور چھجا سا بن کر جھکا ہوا تھا۔ صدیوں کی گروتھ سے موٹے موٹے تھن متھنے ڈنٹھلوں کے رسے سے بٹے پڑے تھے: کچھ نیچے کچھ پہاڑ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ، کچھ موٹے ٹھگنے درختوں کی کمر میں کچھ ان کی ٹہنیوں میں اور کچھ جھولوں کے انداز میں جن کی گولائیاں تو تھیں لیکن ان کے سرے کدھر بندھے تھے، یہ نظر نہیں آتا تھا۔

"چمپنزی! چمپنزی!" یوسف نے اپنی موٹی موٹی چمک دار آنکھیں عینک کے روشن روشن شیشوں کے پیچھے گھما کر ہانک لگائی "چمپنزی!"

"کدھر؟ کدھر؟" ہم نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"وہ دیکھو — وہ" یوسف ظفر نے ایک محقق زوآلوجسٹ کی طرح کہا "وہ سامنے، نئی پرانی بیلوں کے ٹیڑھے چھپر تلے — وہ۔"

جب یوسف ظفر نے ایک چنچل بچے کی طرح "وہ وہ" کہتے ہوئے اس کی طرف پے در پے اشارے کیے تو اس نے آزردہ ہو کر کہا "میں چمپنزی نہیں، ایک سادہ بندر ہوں — عام بھورا بندر۔"

اس کی یہ بات سن کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ کچھ خوف، کچھ حیرانی، بہت ساری بے یقینی — اس کے ساتھ ساتھ جانور کی انسانی گفتار کا رعب۔ ہم تینوں پتھر کے بت بنے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔

پھر اس نے تھوڑا سا کراہتے ہوئے، قدرے دھیمی آواز میں کہا "صاحبو! کیا کروں، بیمار ہوں۔ بیمار نہ ہوتا تو بھی آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکتا۔ میری عمر میں پہنچ کر ہر کوئی لاچار ہو جاتا ہے۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

مختار صدیقی نے کہا "ہم مری سے حاضر ہوئے ہیں اور سرکاری ملازم ہونے کے ناتے آج کل مری ہی کے ایک ہوٹل میں مقیم ہیں۔"

یوسف ظفر نے یہ سوچ کر کہ میں کیوں پیچھے رہوں، جلدی سے کہا "آج چھٹی کا دن تھا۔ ہم گھومتے گھماتے ادھر آ نکلے تو راستے میں بارش نے پکڑ لیا — دراصل ہم دوپہر کا کھانا کھانے باڑیاں جا رہے تھے۔"

بندر بولا "باڑیاں میں زیادہ تر ریٹ بھون کر مٹن کے نام سے فروخت کرتے ہیں۔ اگر آپ سوار گلی چلے جائیں تو وہاں صرف ایک ہی دکان ہے جس کا بھنا ہوا گوشت اس سارے علاقے میں مشہور ہے۔ اس کا کھانا آپ کے لیے مناسب رہے گا۔"

میں نے کہا "آپ کو کس نے بتایا کہ وہاں کا کھانا سب سے عمدہ ہے؟"

بندر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے بے زاری سے کہا "او بھائی بتانا کس نے تھا۔ میں نے خود کئی مرتبہ کھایا ہے وہ کھانا۔ جب ہمارے لڑکے بالے اودھر ہوتے تھے تو کئی مرتبہ پکی پکائی ہنڈیا چولہے سے اتار کر لے آتے تھے۔ ہم خود بھی کھاتے تھے اور اڑوس پڑوس بھی بھجوا دیتے تھے۔ لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔"

میں تو بندر صاحب کے اس سوشل آرڈر کی تبدیلی پر دل برداشتہ تھا کہ ہر فقرہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولتے تھے لیکن میرے ساتھی ایک اور حیرت میں گم تھے۔ مختار صدیقی نے اپنے نستعلیق لہجے میں پوچھا "آپ اردو بہت اچھی بولتے ہیں، شین قاف سے درست — یہ آپ نے کہاں سے سیکھی؟" لیکن پیشتر اس کے کہ بندر اس کا جواب دیتا، یوسف ظفر نے بے صبری سے پوچھا "کیا آپ کبھی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب سے ملے ہیں؟"

بندر نے بڑی شرافت سے سر جھکا کر کہا "مجھے اُن کی خدمت میں حاضری دینے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ میں اور بہت سے مشاہیر سے ضرور ملا ہوں — لیکن پیشتر اس کے کہ ہماری گفتگو طول پکڑ جائے، آپ اس پتھر پر تشریف رکھیے اور اس سخت نشست کو بھی زانوے جان تمنا خیال فرمایئے۔ کیا کریں، مجبوری ہے۔ یہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔" پھر وہ ذرا رکا اور اپنے نیچے سے کسی بوٹی کا پتہ نکال کر چباتے ہوئے بولا "آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔"

یوسف ظفر نے کہا "یہ مختار صدیقی ہیں جنہیں ہم پیار سے منشی مختار صدیقی کہتے ہیں۔ یہ اشفاق صاحب ہیں اور آپ کا یہ خادم یوسف ظفر کہلاتا ہے۔"

بندر نے بڑی خوش دلی سے کہا "یوسف ظفر اور مختار صدیقی صاحبان کو تو ہم بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں لیکن ان صاحب سے ہم اس قدر مانوس نہیں ہیں۔ پھر

اب جو آپ کے ساتھ تشریف لائے ہیں تو یہ بھی ہمارے سر کا تاج، دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہیں۔"

بندر نے کہا "میرا نام ہورو ہے اور میں بندروں کے قدیم قبیلے Homunculus سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا دادا اس علاقے کا سردار تھا اور اس کے بتیس بندریوں سے آٹھ سو بچے تھے جو خدا کے فضل سے سارے صحت مند تھے اور لمبی طبعی عمر پا کر اپنے اپنے بڑھاپے میں فوت ہوئے۔"

اب کی بار مختار صدیقی نے حیران ہو کر کہا "صاحب من! آپ بہت اچھی اردو بولتے ہیں اور آپ کا لب و لہجہ خالص اہل زبان کا سا ہے۔ ہم سے تو باوجود کوشش کے ایسا تلفظ اور ایسا لحن پیدا نہ ہو سکا، حالانکہ ہم بھی آپ کے اسی علاقے کی پیداوار ہیں۔"

ہورو نے کہا "میں ایام جوانی میں گھر والوں سے ناراض ہو کر ڈیرہ دون چلا گیا تھا۔ وہاں کچھ عرصہ آوارہ گردی کرنے کے بعد ڈگشی کے ایک معروف خانوادے کا گھر داماد ہو گیا۔ بیوی میری تنک مزاج تھی۔ اس کے ساتھ گزارا نہ ہو سکا۔ میں اپنے پھول سے دو بچے چھوڑ کر سدھارتھ کی طرح گھر چھوڑ کر متھرا کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ یہ زبان کا تحفہ وہاں کے چوبوں، برہمنوں اور کائستھوں کی دین ہے۔ بھلے لوگ تھے اور بھلا زمانہ تھا۔ استاد صاحب اب وہ بات نہیں رہی۔" پھر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سر دیوار کے ساتھ لگا لیا۔

منشی مختار صدیقی نے جنتر منتر تنتر پر بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ وہ کسی زمانے میں روحانیت کے تجربے بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے ہمیں متنبہ کیا کہ یہ بندر نہیں، کوئی بدروح ہے جو ہمارا راستہ روکنے کے لیے بھیجی گئی ہے اس لیے ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ میں چونکہ ایسی سپر نیچرل باتوں پر بالکل اعتقاد نہیں رکھتا تھا اس لیے میں نے وہاں سے ہلنے سے انکار کر دیا اور استاد یوسف ظفر کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

استاد نے پوچھا "آپ کے کوئی بال بچے — کوئی بیٹے پوتے؟"

"سب چھوڑ گئے بھائی، سب چلے گئے۔" ہورو نے دکھی لہجے میں جواب دیا

"ایک بڑھیا رہ گئی تھی سو پچھلے سال وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اب میں ہوں اور اس گپھا کا کونہ ہے۔ جس دن موت آئی، چپ چاپ اس بدن سے نکل جاؤں گا اور خدا کا شکر ادا کروں گا۔"

اب مختار صدیقی میں پھر بات کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا۔ اس نے اپنی مخصوص مدھم مگر کراری آواز میں پوچھا "جناب کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی، غزل و رباعی سے کوئی شغف؟"

بندر نے پرانی یادیں سمیٹتے ہوئے کہا "متھرا، بندرابن اور آگرے کے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی لیکن صرف سننے کی حد تک۔ درختوں کی اونچی ڈالیوں میں بیٹھ کر بڑی بڑی راتیں گزاریں لیکن صرف داد دینے کی حد تک۔ خود بھی کبھی کبھار تک بندی کی لیکن صرف اپنا دل بہلانے کے لیے۔ اشعار میں وزن بھی ہوتا روانی بھی، الفاظ کا دروبست اور ردیف قافیے کا حسن بھی اپنی جگہ موجود ہوتا لیکن شعروں میں تغزل نام کو نہ ہوتا۔ میں نے اپنا کلام کسی کو سنانا مناسب ہی نہ سمجھا۔" پھر وہ منہ اوپر اٹھا کر زور سے ہنسا اور کہنے لگا "کیا بندر اور کیا بندر کی شاعری! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ ــــ سب کچھ مٹ جائے گا صرف اس کا چہرہ باقی رہ جائے گا۔"

یوسف ظفر نے ایک مرتبہ پھر پوچھا "ہورو صاحب! پہلی بات تو یہ کہ آپ نے انسانوں کی زبان کہاں سے سیکھی اور اگر سیکھی ہی سیکھی تو ایسی اچھی کیسے سیکھ لی؟ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ آپ تو بالکل اہل زبان کی طرح کلام کرتے ہیں۔"

ہورو نے "شکریہ" کہہ کر بتانا شروع کیا کہ "انگریزوں کی آمد کے فوراً بعد اس علاقے میں کچھ ایسے لوگ تحقیقی کاموں پر مقرر ہو کر آ گئے تھے جو ہمیں ستاتے تھے اور ہمیں اپنے پرانے گھروں سے نکالتے تھے۔ یہاں کے راجوں کے ساتھ ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا صدہا سال کا ساتھ تھا۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی جھگڑا، دنگا فساد یا نکا فضیحتی نہیں ہوئی۔ بھائیوں کی طرح وقت گزرا اور اچھا گزرا۔ لیکن جب انگریز آئے تو اپنے ساتھ گولہ بارود اور توپ تفنگ کے ساتھ ساتھ نظریات کے پشتارے بھی اٹھا لائے۔ ہمیں ان کے نظریات کے ساتھ کوئی کد نہیں تھی لیکن جب انہوں نے اپنے

نظریات کو ہم پر ٹھونسنا شروع کر دیا تو پھر ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم ساری بندر جاتی نے دن رات ایک کر کے پہلے اپنی زبان اردو میں دسترس حاصل کی، پھر عملاً ان کی زبان بھی سیکھ لی۔ یہ مجبوری اس لیے پیدا ہوئی کہ ہمیں ان کے ساتھ مباحثوں میں شریک ہونا پڑتا تھا اور ان کے ساتھ لمبے ڈایلاگ کرنے پڑتے تھے — " پھر وہ ذرا رک کر اور بڈھے آدمیوں والا کھٹا اور لمبا ڈکار لے کر بولا "یہ فرنگی لوگ بحث مباحثے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ گیان دھیان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔"

میں نے اس کی سنی ان سنی کر کے کہا "بندر صاحب! آپ کے اور ان کے درمیان وجہ نزاع کیا تھی اور مباحثے اکثر کن موضوعات پر ہوتے تھے؟"

ہورو صاحب نے انگشت شہادت اٹھا کر کہا "ایک اور صرف ایک موضوع پر..... وہ کہتے تھے ہم انسان لوگ بھی پہلے آپ لوگوں کی طرح بندر ہی تھے، پھر ہم نے کچھ اعلیٰ درجے کی ارتقائی منازل طے کر کے خود کو انسانی صورت میں مبدل کر لیا اور تم لوگ بندر کے بندر رہ گئے۔"

مختار صدیقی کہنے لگا "یہ تو ایولیوشن کی پرانی تھیوری ہے اور بالکل ٹھیک اور سو فیصد راست تھیوری ہے۔ اس میں جھگڑے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔"

"مختار صاحب! مختار صاحب" ہورو بندر نے درد بھرے لہجے میں پکار کر کہا "آپ تو یہ بات نہ کہیں خدا کے لیے — آپ تو گیانی لوگوں میں سے ہیں اور اتنے بڑے شاعر ہیں۔"

"اس میں شاعر ہونے یا نہ ہونے کی بات نہیں ہورو صاحب" یوسف ظفر نے سمجھاتے ہوئے کہا "اس تھیوری پر تو زمانے نے اور تاریخ کی گزری ہوئی صدیوں نے اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس میں تو بحث کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔"

ضعیف بندر ہمارے خیالات سن کر کچھ مایوس سا ہوگیا اور سر جھٹک کر بولا "آپ بھی اچھے موحد ہیں جو ایسی باتوں کو سچ جان کر روا سمجھتے ہیں۔ یہی باتیں ہم سے ارتقائی گروہ کے سائنس دان کیا کرتے تھے اور انہی لوگوں کو مسکت جواب دے کر ہم ان کے منہ بند کر دیا کرتے تھے۔ اب وہ لوگ مسلسل پراپیگنڈے کے زور پر جیت گئے اور ہماری منطق اور سائنٹفک دلیلیں ان کے سامنے کمزور پڑ گئیں۔"

"سائنس تو ان کی ہے بادشاہو" میں نے اونچے لہجے میں کہا "پھر آپ کی دلیلیں کدھر سے سائنٹفک ہوگئیں؟"

ہورو نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھ کر کہا "میاں صاحب زادے، ہم بے انصاف نہیں ہیں۔ جو کام سائنس نے کر دکھایا، اس کی تعریف کرتے ہیں لیکن جہاں وہ دلیل کی پٹڑی سے اتری وہاں ہم نے اس کا گلا دبوچا۔ ہم بندر لوگ ہیں، کوئی مولوی یا پادری نہیں کہ ضد میں آ کر اپنی ہی ہانکتے جائیں۔ ہم دلیل سے بات کرتے ہیں اور دلیل و برہان سے اس کا جواب چاہتے ہیں۔"

مختار صدیقی ذرا سا آگے جھک کر بندر کی بات سننے لگا۔

ہورو نے کہا "سب سے پہلے تو ارتقا کے بابا آدم نے نا سائنسی بات کی کہ اگر..."

"چارلس ڈارون نے؟" یوسف ظفر نے کہا۔

"ناں جی ناں" ہورو نے بے زاری سے کہا "اس کے دادے نے۔"

"ارسمس ڈارون نے!" مختار صدیقی نے جلدی سے کہا۔

"جی جناب" ہورو کہنے لگا "اس نے اور اس کے ایک فرانسیسی ساتھی نے پولیس والوں کی طرح ایک قاعدہ کلیہ ہی قائم کر لیا کہ جانوروں کے اختصاص اور ان کی صفات اکتسابی ہوتی ہیں — جیسے سورج کی مسلسل حدت سے جانوروں کی رنگت پیلی پڑ گئی، بدن سختیاں سہتے سہتے اور چوٹیں کھاتے کھاتے موٹی اور بھدی کھال کے حامل ہوگئے، اونٹوں کے دوزانو ہو کر جھکنے اور دوزانوں کا سہارا لے کر اٹھنے سے ان کے گوڈوں پر پیڈ پیدا ہو گئے — یہ — اور اسی طرح کی بے شمار باتیں پنڈت پانڈے اور بسیار گو زٹلی تو کہہ سکتے ہیں لیکن ایک سائنس دان کو زیب نہیں دیتیں۔"

"لیکن انھوں نے اس کے ثبوت بھی تو فراہم کر کے دکھائے۔" میں نے قدرے غصے سے کہا۔

"کوئی ثبوت نہیں میاں صاحب زادے" ہورو سنجیدگی سے بولا "یہ سب اندازے اور ٹوٹے ہیں۔ سائنس دان بھی اٹکل پچو کی سیڑھی پر سوار ہو کر بہت اوپر نکل جاتے ہیں۔ نہ صرف خود نکلتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اکھاڑ دیتے ہیں۔" ہورو بڑی

کمینہ طنز کے ساتھ ہنسا اور پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح چھوٹے بخاری صاحب بڑے بڑے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے "ودی ودی" کہہ کر سر ہلایا کرتے تھے۔

مختار صدیقی آنکھیں جھپکے بغیر بندر کے سامنے اپنی ذہانت کا پھن اٹھائے کھڑا تھا مگر اس کے کندھے اندر کو جھک کر علم کی بھیک سمیٹنے کو بڑا سا کشکول بن گئے تھے۔ سائنس اور سائنس دانوں کے خلاف ہورو کی کھلی اور بے حیائی کی گفتگو مجھ سے برداشت نہ ہو سکی اور میں منہ موڑ کر دوسری طرف کی شاخوں اور پتوں کو دیکھنے لگا۔ ہورو کہہ رہا تھا "صاحبان من! ایک لمحے کے لیے مشاہدے کی آنکھیں کھول کر، علم کا ہاتھ بصیرت کے سینے پر رکھیے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ارتقا کی تھیوری کس حد تک سائنٹفک تھیوری ہے۔ ارتقا کے علم بردار زندگی کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک تو زندگی اپنے آپ کو تکثیر کرنے کی قوت رکھتی ہے یعنی اپنی جیسی، عین مین اپنی جیسی، ایک اور زندہ شے پیدا کر سکتی ہے۔ دوسرے اپنے ماحول اور باہر کے محرکات سے متاثر ہوتی ہے اور تیسرے یہ کہ زندگی بڑھتی ہے، پھلتی پھولتی ہے اور اس کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔"

"اور یہ تینوں خصوصیات ایسی ہیں" میں نے اونچی آواز میں کہا "کہ سوائے زندگی کے، ان کا تسلسل اس انداز میں اور کہیں نہیں ملتا۔"

"بس اسی غلط فہمی کے وہ بھی مارے ہوئے تھے۔" بزرگ بندر نے پرانی یادوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا "ڈارون اور اس کے ساتھی سائنس دان ڈارون کی زندگی میں بھی حیات کی یہی تعریف کرتے تھے اور اس کے بعد بھی طالب علموں کو یہی پڑھاتے رہے۔"

استاد یوسف ظفر نے بڑی استقامت کے ساتھ میرا اور میرے علاوہ مختار صدیقی کا ساتھ دیتے ہوئے بلکہ اپنی روشن اور چمک دار آنکھوں کی وساطت سے ساری مہذب اور کل تعلیم یافتہ دنیا کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "ہورو صاحب! یہ تو حیات کی ایک طے شدہ ڈیفی نیشن ہے، جسے کل دنیا تسلیم کر چکی ہے۔ ہر ملک کی ہر قوم اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے نصاب میں اسے درج کر چکی ہے۔ اس پر تو کوئی دو رائیں ہو ہی

نہیں سکتیں۔"

بزرگ بندر نے غور سے یوسف ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "استاد یوسف ظفر آپ تو صاحب نظر شاعر ہیں، پھر آپ کس طرح سے ان لوگوں کے بہلاوے میں آگئے جو حیات کی ڈیفی نیشن ان تین نکات کی بنا پر کرتے ہیں!"

مختار صدیقی بالکل خاموش، ساکت و صامت کھڑا تھا اور اپنے پرانے خیالات کی کریز کرتے ہوئے اندر سے نیا حوصلہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہورو نے کہا "مختار صدیقی صاحب! اگر زندگی کی بنیادی ڈیفی نیشن یہ ہے کہ وہ اپنے جیسی ایک اور زندگی تخلیق کر سکتی ہے تو پھر شعلے کے بارے میں کیا خیال ہے جو ایک مرتبہ بھڑک اٹھتا ہے تو پھر اس سے کئی شعلے اور پیدا ہونے لگتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے سارا جنگل اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ آپ انسانوں نے تو جنگل کو کبھی اتنے قریب سے دیکھا نہیں اور نہ ہی اس کے اندر لپکنے، بھڑکنے اور پھیلنے والی آگ کا اندازہ کیا ہے۔ ہم نے اپنے خاندانوں کے خاندان اور گروہوں کے گروہ جنگلوں کی آگ کو بھینٹ کیے ہیں — ہم جانتے ہیں کہ شعلے سے شعلہ کس طرح جنم لیتا ہے اور آگ سے آگ کیسے جنم لیتی ہے لیکن ہم اس کو زندگی تو نہیں کہتے، اس کو حیات تو نہیں تسلیم کرتے حالانکہ شعلے سے شعلہ اور چنگاری سے جنم لینے والی چنگاری ارتقا والوں کی حیاتیاتی ڈیفی نیشن پر بالکل پوری اترتی ہے۔"

یوسف ظفر نے چلا کر کہا "بس بس! زندگی اور زیست کو مرگ اور ممات کے مماثل سے واضح نہ کیجئے۔ کونپل سے پھوٹتی ہوئی کونپل کو شعلہ نہ بنائیے۔"

بزرگ بندر نے غور سے یوسف ظفر کی طرف دیکھا اور بڑے سبھاؤ کے ساتھ کہا "نہیں صاحب من! نہیں۔ ہم کیوں ہلاکت و ممات کی بات کریں اور انتقال و وفات کا ذکر کریں۔ کیوں نہ تعمیر و تسلسل کی مثال سے واضح کریں کہ مصری میں جب کرسٹل بنتا ہے تو ایک شاخ نبات سے دوسری شاخ پیدا ہوتی ہے۔ عطار شیرے میں بتی ڈال کر ڈھیروں ڈھیر کرسٹل مصری کے بنا لیتا ہے — لیکن اسے آپ زندگی کا عمل یا زندگی کی نشانی نہیں کہہ سکتے۔" پھر وہ ہنسا اور کہنے لگا "چلئے آپ کی اس قدر تشفی تو ہوگئی کہ بوڑھا بندر شعلہ جوالا سے نکل کر لعل لب شکر خارا تک پہنچ گیا۔ اب کسی روز

ابتدائے آفرینش کے گریختہ آہو کو بھی پکڑ لائے گا۔"

"یہ تو آپ نے درست فرمایا" مختار صدیقی نے نہایت ادب سے عرض کیا "لیکن زندگی کی یہ یکتا خصوصیت کہ وہ اپنے گرد و پیش سے، اپنے ماحول سے اور اپنے محرک سے اثر پذیر ہوتی ہے — اس پر آپ نے غور نہیں کیا۔"

ہورو نے پرانے بے تکلف دوست کے انداز میں کہا "مختار جی! آپ تو شاعر ہیں اور بڑے گہرے جذبوں کے شاعر ہیں۔ ماحول اور محرک کے اثرات تو بلبلے پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں، بنتا بھی ماحول کے دباؤ سے ہے اور ٹوٹتا بھی اسی کی تحریک پر ہے۔ کیا آپ اسے زندہ اشیاء کی فہرست میں رکھیں گے؟ اسے ایک جاندار سمجھ کر اس سے تخاطب کریں گے؟" پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فضا میں دیکھتے ہوئے کہا "ہماری ان سے بڑی بحثیں ہو چکی ہیں سر، ان ارتقائی سائنس دانوں سے — لیکن وہ زور آور لوگ ہیں، حکومتوں والے ہیں، انعاموں والے ہیں، طاقت والے ہیں۔ سارا میڈیا ان کے ساتھ ہے۔ دنیا بھر کی افسر شاہی، فوج سپاہی، عسکر لشکر ان کے ساتھ ہیں۔ وہ ہماری بات کیوں مانیں گے بھلا! بس چپ ہی رہنے دیجئے۔"

میں نے کہا "معاف کیجئے، آپ کچھ زیادہ ہی ضدی بندر ہیں جو سائنس کی اتنی بڑی تھیوری کو اس قدر آسانی سے جھٹلا رہے ہیں۔"

میری اس بات پر وہ تڑپا اور دونوں ہاتھوں سے زور کی تالی بجا کر بولا "نہ میرے سوہنا! نہ میرے راجا۔ ہم اس تھیوری کو یا کسی بھی تھیوری کو جھٹلاتے نہیں ہیں، ہم تو اس پر فنی اور منطقی گفتگو کرتے ہیں اور پھر یہ تو ایک تھیوری بھی نہیں ہے — ایک پیراڈائم ہے، ایک مفروضہ اور ایک اندازہ ہے۔ ابھی تو اسے تھیوری بننے میں کئی چومکھی لڑائیاں لڑنی پڑیں گی۔"

مختار صدیقی ابھی تک دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، جیسے سکول کے بچے صبح سویرے دعا گاتے وقت باندھا کرتے ہیں، چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "سر اپنے جیسے ہم جنسوں کے باہمی اختلاط سے زندگی میں پھیلنے کی ایسی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی گروتھ کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔ یہی اس کی بین نشانی ہے۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں آپ نظر نہ آنے والی مخلوق بیکٹیریا ہی کو لے لیں، وہ بھی ایک

دوسرے کے تال میل سے اور ایک دوسرے کے انگ سے انگ ملا کر اس قدر تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے کہ اس کی پیداوار کو روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔"

بزرگ بندر نے بڑے آرام سے کہا "منشی جی! وائرس اس سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھتا ہے لیکن اس کی گروتھ زندگی کے طے شدہ اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ نہ تو اس کے اندر سے کچھ پیدا ہو کر اس میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور نہ ہی وائرس کسی دوسرے وائرس کے انگ سے انگ ملا کر اپنی پیداوار میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن جب بڑھنے پر آتا ہے تو اللہ توبہ! اس کی تیز رفتاری کے سامنے ساری پرانی کلاسیکی مخلوق کا عمل توالد و تناسل چھوئی موئی بن جاتا ہے۔"

میں نے اور یوسف ظفر نے حیرانی سے ہورو کو دیکھا تو وہ ہماری کم علمی کا اندازہ لگا کر کہنے لگا "وائرس اپنی آبادی میں دوسرے جانداروں کی طرح اضافہ نہیں کرتا۔ اس کے پاس ایک اور ہتھیار ہے۔ وہ کسی ایک جرثومے کو مغلوب کر کے اس کے بائیو کیمیکل اجزاء کو خود اپنا لیتا ہے اور پھر وہاں بیگانی ہتھی تھما تھما کر اپنی پیداوار میں اضافہ شروع کر دیتا ہے۔ بس پھر چل سو چل۔ اس کی پیداوار کے سامنے تو سمندر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔"

میں نے اس سے کچھ اور پوچھنا چاہا تو مختار صدیقی نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا کہ اس بزرگ بندر کے سامنے ہمارا جو بھی سوال ہوگا وہ احمقانہ اور طفلانہ ہوگا۔

ہورو نے منشی کا رویہ قدرے سخت جان کر مجھ سے کہا "میاں برخوردار! یہاں بہت بڑے بین الاقوامی مباحثے، مناظرے اور مباطلے ہوتے رہے ہیں اور دنیا بھر کے عظیم ترین سائنس دان ادھر تشریف لا کر ہم سے گفتگو کرتے رہے ہیں لیکن ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان بندر سے بنا ہے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ بہت سے انسان خدا کے حکم سے مجبور ہو کر بندر ضرور بنے ہیں لیکن وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ہم کہتے ہیں کہ بات تم بھی ٹھیک کرتے ہو لیکن الٹے ہاتھ کی کرتے ہو۔ تم سیدھے سبھاؤ اپنی شکل نہیں دیکھتے ہو، آئینے میں دیکھ کر بولتے ہو اور آئینے کی شکل ہمیشہ الٹ جاتی ہے۔ دایاں بایاں ہو جاتا ہے اور بایاں دایاں۔ لیکن ہماری یہ بات منطقی یا

سائنٹفک نہیں ہے، محض ان کو زچ کرنے کی ہے کہ انہوں نے اپنی حماقت اور بے علمی سے ہم کو بھی بہت ملول و بے زار کیا ہے۔"

منشی مختار صدیقی نے کہا "حضور! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انسان کس طرح بندر بن گئے؟"

ہورو نے کہا "کیا یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ بندر کس طرح سے انسان بن گئے؟"

میں نے کہا "جناب عالی یہ بات نہ صرف سمجھ میں آ گئی ہے بلکہ سائنس دانوں نے پایہ ثبوت تک پہنچا دی ہے۔"

مختار صدیقی نے کہا "ٹھہر جا یار، پہلے ان کی بات سننے دے۔"

بزرگ بندر نے کہا "جب کسی شے میں کمتری اور گھٹاؤ پیدا ہونے لگتا ہے اور اس کے "ہونے" میں نقدان کی پھپھوندی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اس شے کی قدر و قیمت کم ہونے لگتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آپ نے دیکھا کہ دنیا کی بیشتر کرنسیاں گھاٹے ٹوٹے کا شکار ہوگئیں۔ کچھ کرنسیاں تو ایسی ڈی ویلیو ہوئیں کہ ان کا روپیہ ایک پیسے کا ہوگیا۔ یہی حال انسان کا ہے — جب تک کھرا رہتا ہے، اشرف المخلوقات ہے اور اس کی ٹنکار دور تک سنائی دیتی ہے لیکن جب ڈی ویلیو ہو جاتا ہے تو پھر اسفل السافلین کے گرداب میں پھنس جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ان ڈی ویلیوڈ انسانوں کے ساتھ ہوا۔ خدا نے حکم دیا کہ چلو بندر بن جاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ چنانچہ اچھے بھلے انسان تھے اور دیکھتے دیکھتے بندر بن گئے۔ خود میرے ننھیال کا ایک بہت بڑا گھرانہ بندر بن گیا تھا۔ عاد و ثمود کے زمانے میں وہ ایک لمبا سفر طے کر کے کوہ شوالک کے دروں میں آباد ہوگئے تھے۔"

"آپ کو کس نے بتایا؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا "او بھئی ہمارے پڑنانا کے پاس پورا شجرہ نسب تھا اس گھرانے کا۔ سب کے نام اور رتبے درج تھے اس میں۔ میرے ننھیال تو چونکہ بیشتر بندر بن گئے تھے اس لیے وہ تو اپنے شجرہ نسب کو پڑھ نہیں سکتے تھے لیکن جو ابھی انسانی صورت میں رہ گئے تھے، وہ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔"

"لیکن آپ کو اس شجرہ نسب کا علم کیسے ہوا، آپ تو بندر تھے؟" میں نے نکتہ اٹھایا "آپ تو وہ دستاویز پڑھنے سے قاصر تھے۔"

"وہ تو ہم اب بھی ہیں اشفاق میاں۔" ہورو نے بزرگوں کی سی رواداری سے جواب دیا "اس کا اعتراف ہم ہمیشہ کرتے رہیں گے کہ ہم پڑھنے لکھنے سے قاصر ہیں اور تحریر کو اٹھا نہیں سکتے۔ وہ سائنس دان جن سے پوری نصف صدی تک ہمارے مباحثے ہوتے رہے، وہ البتہ ہر قسم کی زبان پڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے ہمارے پرکھوں کے نسب نامے دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی ہمارے بزرگ پہلے انسان ہوتے تھے اور عاد و ثمود کی بڑی بڑی سلطنتوں کے آس پاس ان کی بھی راج دھانیاں تھیں۔"

"لیکن انہوں نے کیا کیا تھا؟" میں نے پوچھا "ان افعال کی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں۔ نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مخصوص غلطی کیا کی تھی اور ان کا صریحاً کیا گناہ تھا۔"

"جہاں تک ہمیں معلوم ہے" ہورو نے کہا "انہوں نے حیوانوں کے افعال اختیار کر لیے تھے اور جب خدا کے نبی اور رسول انہیں ایسی حرکتوں سے منع کرتے تھے تو وہ اکثر یہ دلیل دیا کرتے تھے کہ جب حیوان اور دوسرے چرند پرند ہر طرح کا عمل کرنے میں آزاد ہیں تو پھر انسانوں پر پابندی کیوں؟ ہم بھی تو انہی کی طرح کی ایک مخلوق ہیں اور ہمیں بھی تو اللہ نے بنایا ہے۔ ہم سب وہی کچھ کرنا چاہیں گے جو دوسرے جاندار اور حیوان کرتے ہیں۔ ہم بھی ان کی طرح آزاد اور مبرا اور معرا رہنا چاہیں گے کہ ہم کسی بھی صورت میں ان سے کم نہیں ہیں — چنانچہ حکم ہوا کہ جاؤ بندر اور سور بن جاؤ — اور حکم کی تعمیل ہوئی!"

منشی مختار صدیقی بجائے اس کے کہ ہورو سے کوئی فلسفیانہ بات کرتا یا اس کو اپنے علم کی مار دیتا، خود اسی کا ساتھی سا بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بڑے ادب سے پوچھنے لگا "آپ کے یہ مباحثے اور ارتقائی سائنس دانوں کے ساتھ سیمینار، کانفرنسیں اور اجتماعات یہاں کیوں ہوتے رہے اور اس مقام کو کیوں منتخب کیا جاتا رہا حالانکہ میرے حساب سے کرہ ارض پر یہ علاقہ کوئی ایسا اہم مقام نہیں ہے؟" پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے باہر کے پہاڑوں کا نظارہ کرتے ہوئے کہا "نہ تو یہ بندروں کی آبادیوں کا کوئی صدر مقام

روایت موجود ہے۔ پھر آپ لوگوں کی کانفرنسیں یہاں کیوں ہوتی رہیں؟"
بزرگ بندر نے آنکھیں موند کے، تھوتھنی اوپر اٹھا کر مٹھار کے کہا "منشی جی
یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے مباحث آفرینش سے اور زندگی کی ابتدا اور اس کے
چلن سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کو اسی مقام پر واقع ہونا تھا کہ یہی وہ متبرک
مقام تھا جہاں ایسی کانفرنسوں کا تقدس برقرار رہ سکتا تھا۔"

"گویا مقام کی نشان دہی آپ نے کی؟" یوسف ظفر نے پوچھا۔

"جی جناب! مقام کی نشان دہی ہم نے کی اور مباحث کے مقام کا تعین ہماری طرف سے کیا گیا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے فرسٹ ایئر کے ایک جوشیلے طالب علم کی طرح پوچھا "کس لیے آپ لوگوں نے یہ جگہ منتخب کی؟"

"اس لیے میاں صاحب زادے!" ہورو نے اطمینان سے جواب دیا "کہ یہ جگہ پاکیزہ ہے اور اس کا ایک عظیم پیدائش کی برکت کے ساتھ تعلق ہے۔"

ہم تینوں بالکل خاموش کھڑے تھے اور ہورو کہہ رہا تھا "ابتدائے آفرینش کے معاملے میں ہمارے مخالف اور مدمقابل — کہ جن کا ہم دل سے احترام کرتے ہیں — چاہے کچھ بھی کہہ لیں جب تک ان تین حقیقتوں کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ لیں گے، ان کی تحقیق کے راستے بند رہیں گے۔ اول تو یہ کہ زندگی کی ابتدا اور پیدائش کا عمل ماں باپ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے جیسے حضرت آدم کی پیدائش، پھر یہ کہ پیدائش کا عمل بغیر ماں کے بھی ہو سکتا ہے جیسے حضرت حوا کی پیدائش اور آخر میں یہ کہ پیدائش بغیر باپ کے بھی ہو سکتی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش —"

یہ بات کہتے ہوئے بزرگ بندر نے اپنی پوری آنکھیں کھولیں۔ ہم تینوں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ کر بولا "یہ پہاڑ اسی محترم و مقتدر ہستی اور پاک نہاد و پاک باز خاتون حضرت بی بی مریم کا مدفن ہے۔"

ہم تینوں کی ایک ساتھ چیخ نکل گئی!

ہورو نے کہا "حضرت عیسیٰؑ کے مقام معلیٰ پر پہنچ جانے کے بعد حضرت مریمؑ کا

بیت اللحم میں رہنا مشکل ہوگیا اور وہ دور دراز کے سفر کرتی اس مقام پر پہنچ گئیں۔ یہاں کے لوگوں نے ایک نیک اور پاک باز ہستی کا استقبال عقیدت کے دل پر ہاتھ رکھ کے کیا اور جب تک وہ ان لوگوں کے درمیان رہیں — بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کی عقیدت کا مرکز بن کر رہیں۔ لوگ انہیں ان کے عبرانی نام کے حوالے سے مائی "ماری" کہہ کر پکارتے تھے اور ان کی طرف پیٹھ کر کے نہیں چلتے تھے۔ جب وہ فوت ہوئیں اور انہیں ان کے عقیدے کے مطابق یہاں دفن کیا گیا تو اس علاقے کے لوگوں نے اپنے پہاڑ کا نام مائی ماری کا پہاڑ رکھ لیا۔ بعد کے آنے والے اسے ماری کے پہاڑ کے بجائے مری کا پہاڑ کہنے لگے اور ڈاک خانے والوں نے اپنی سہولت کے لیے اسے کوہ مری کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔"

ہم تینوں میں سے کسی کو بھی کچھ پوچھنے کا یارا نہ تھا۔ یہ الگ باب بلکہ ایک الگ کتاب تھی اور ہم اس کتاب کو اس وقت نہیں کھول سکتے تھے۔

ہورو نے کہا "مائی ماری صاحب کا مدفن ہمارے بزرگوں کو معلوم تھا لیکن بعد کی آنے والی نسلوں نے اپنی خراباتیوں میں گم ہو کر اس کو فراموش کر دیا۔ بدھ مت کی پرانی کتابوں میں البتہ یہ بات صراحت سے لکھی ہے کہ "ہماری دانش گاہ ٹیکسلا سے تھوڑی ہی دور مائی ماری صاحب کا مزار ہے جو ایک جلیل القدر پیغمبر کی بہت ہی برگزیدہ والدہ تھیں۔"

ہورو کے پاس بات کرنے کا ایک دل نواز ڈھنگ تھا۔ وہ صرف زبان ہی سے بات نہیں کرتا تھا بلکہ آنکھوں سے، ہاتھوں سے، سانسوں سے اور خاموشیوں سے بھی گفتگو کرتا تھا۔ گفتگو کے دوران جب وہ اچانک کسی مقام پر رک جاتا تو اس کی بات اور بھی بامعنی ہو جاتی۔ اس نے سر جھکا کر اپنے آپ سے کہا "چونکہ سائنس دانوں کے ساتھ ہمارا جھگڑا ابتدائے آفرینش سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ہم نے اپنی کانفرنسوں اور میٹنگوں کے لیے ایک پاک مگر عجوبہ آفرینش کے اس ذریعے کو اپنایا جسے اللہ کریم نے خاص طور پر منتخب فرمایا تھا۔ اسی ہستی نے جب اس پہاڑی مقام پر اپنا مبارک قدم رکھا تو ہماری جاتی نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کانفرنس ہوگی، وہ اسی مقام پر ہوگی اور جو ڈائیلاگ ہوں گے، وہ اسی علاقے کے اندر رہ کر ہوں گے۔"

اس بزرگ بندر کی یہ دلیل مختار صدیقی اور یوسف ظفر کے لیے تو کافی ہو سکتی تھی لیکن میں اس کے بالکل خلاف تھا اور ہورو کے ساتھ بحث کرنے کے لیے تیار تھا کہ حضرت مریمؑ نے نہ تو کبھی ادھر کا سفر کیا اور نہ اپنی زندگی کے آخری ایام مری کے سلسلہ ہائے کوہ میں بسر کیے۔ گو میرے پاس بھی اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہ تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ لوگ اس معاملے میں میرا ہی ساتھ دیں گے اور میں ہی ہر حال میں کامیاب ٹھہروں گا۔ لوگ دلیل سے بات نہیں کرتے، اپنی پسند ناپسند سے کرتے ہیں!

استاد یوسف اب کچھ تھک سا گیا تھا اور تھکاوٹ سے اس کے چہرے پر تکدر کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے بدن کو زور لگا کر سیدھا کرتے ہوئے کہا "جناب والا! پھر آپ کی کانفرنسوں کا مک مکا کیا ہوا، اور آپ کے متفقہ اعلامیہ میں کیا بات طے پائی کہ ارتقائی تھیوری صحیح ہے یا ابھی اس میں کچھ اسقام باقی ہیں؟"

ہورو نے کہا "استاد جی ایسی باتوں کے کوئی حتمی فیصلے تو ہوتے نہیں، ہر کوئی اپنی اپنی ضد پر قائم رہتا ہے۔ بات چلتی چلتی ابتدائے آفرنیشن پر آ کر رک گئی۔ یہ سن پینتیس کی بات ہے۔"

"ارتقا پر جب بھی بات ہوگی" استاد یوسف ظفر نے کہا "ابتدائے آفرینش کا لازمہ ہر حال میں آئے گا۔"

ہورو نے کہا "اس زمانے میں کوئٹہ میں بڑا زبردست زلزلہ آیا تھا۔ جو بچ رہے تھے، وہ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر عزیزوں رشتہ داروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ادھر بھی بہت سے لوگ آئے۔ ہماری ان دنوں ایک بڑی عالمی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں ہماری جاتی کے لوگوں نے یہ پھڈا ڈالا ہوا تھا کہ اگر بقائے اصلح یعنی سروائیول آف دی فٹیسٹ ہی ارتقائی تھیوری کی بنیاد ہے تو پھر اس کرہ ارض کے اعلیٰ ترین اور ارفع ترین اور طاقت ور ترین شیر تو اس دنیا میں کم ہو رہے ہیں اور ناکارہ و نحیف ہرنیوں کی لرزاں و افتاں ڈاریں موج در موج بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس دنیا میں عقاب اور شاہین تو مٹتے جا رہے ہیں لیکن چڑیوں، ہدیوں اور مولوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے اور سروائیول آف دی فٹیسٹ والا "فٹیسٹ" ناطاقت و نااستوار کیوں ہو رہا

ہے؟ ان سے کوئی جواب تو نہ بن پڑا البتہ انہوں نے کوئٹہ کے زلزلے کا عذر پیش کر کے کانفرنس ختم کر دی۔"

یوسف ظفر نے کہا "لیکن آپ تو ابتدائے آفرینش کی بات کر رہے تھے کہ ارتقائی تھیوری کا گہرا تعلق "اوریجن آف لائف" سے ہے۔"

"وہ تو ہے" ہورو نے تیقن کے ساتھ کہا "اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس کائنات میں لائف کی ابتدا کس طرح سے ہوئی، یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جو سائنس دانوں کے لیے بہت ہی پیچیدہ وائرس بن کر ان کے وجود سے چمٹ گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ پچاس سال سے ان کی مشکل کچھ کم ہو گئی ہے اور انہوں نے ایک نئی تھیوری قائم کر کے اپنی جان ایک بڑے مخمصے سے نکال لی ہے کہ یہ کائنات ایک بڑے دھماکے سے معرض وجود میں آئی ہے اور اس دھماکے کے بعد کائنات کے ہر شعبے نے خود بخود کام شروع کر دیا ہے۔"

"تو آپ کو اس پر کیا اعتراض تھا؟" مختار صدیقی نے حیرانی سے پوچھا۔

ہورو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "حاشا و کلا ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور نہ ہی ہم نے ان کے ساتھ اس پر کسی قسم کی بحث کی تھی — ہمارے بڑے صرف اتنی بات کہتے تھے کہ پیارے انسانو! تم اتنی بات کیوں نہیں مان لیتے کہ خالق کائنات نے "کن" کہا تو ہو گیا! اور جب وہ "کن" کہتا ہے تو ہونے والی شے فوراً ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کائنات "نہ ہونے" سے "ہونے" میں آ گئی اور لامعلوم سے معلوم میں داخل ہو گئی۔ لیکن وہ یہ بات نہیں مانے اور اسی تھیوری پر اڑے رہے کہ بس ایک بڑا سا دھماکہ ہوا، زور کا پٹاخہ چلا اور کائنات وجود میں آ گئی۔ یہی کہتے رہے کہ دھماکہ ہوا لیکن دھماکہ کرنے والا کوئی نہیں تھا — پٹاخہ ضرور ہوا لیکن رنگ ماسٹر کوئی نہیں تھا، ساننٹے والا موجود نہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ ہی کی بات ٹھیک ہے لیکن اس میں تھوڑی سی ترمیم کر لیجیے۔"

"وہ کیا؟" میں نے ذرا غصے سے پوچھا؟"

"وہ یہ اشفاق صاحب" ہورو نے اپنی بڈھی آنکھیں پورے زور سے کھول کر کہا "کہ اُس دھماکے کی ابتدا سمجھ لیجیے۔ وہ یہ کہ خدا نے "کن" کہا اور ایک زور کا

حادثہ ہوا... ایک بگ بینگ ہوا اور یہ کائنات معرض وجود میں آ گئی۔ سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ کسی نے چلایا نہیں، چنانچہ خود بخود چل گیا — بس ہمارے اور ان کے درمیان یہی بنیادی جھگڑا تھا۔ جب بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔"

جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو بزرگ بندر کچھ کھسیانا کچھ ملول اور کسی حد تک دل برداشتہ ہو کر بولا "کوئی لڑکا بالا ہوتا تو اسے درختوں پر چڑھا کر آپ کے لیے ملوک یا اخروٹ وغیرہ اتروانا۔ آگے بادام کا ایک درخت ہے۔ اس کے کچے بادام بہت ہی لذیذ اور دودھیا ہیں۔ لیکن اب یہاں کوئی ہے ہی نہیں اور میری اتنی جان نہیں کہ لپک کر خود درخت پر چڑھ سکوں — بس اب ایسے ہی ہے۔"

مختار صدیقی نے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے یقین دلایا کہ آپ مطمئن رہیے اور خاطر جمع رکھیے اور ان تکلفات میں پڑنے کی زحمت نہ کیجیے۔ آپ کی صحبت سے ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ شاید ہم نصف صدی کے مطالعے سے بھی حاصل نہ کر سکتے — آپ کا بہت بہت شکریہ — بڑی مہربانی۔ خدا آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ ابھی کچھ اور وقت ہمارے درمیان آباد رکھے!

جب ہم تینوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک ساتھ سلام کیا اور اس سے رخصت چاہی تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پوری کوشش کے باوصف وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا۔ ہماری طرف چہرہ کیے بغیر اس نے اپنی روندھی مگر زوردار آواز میں کہا "اس کرہ ارض کے سارے بندر بڑے کرب میں مبتلا ہیں اور رنجوری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اندر ہی اندر ان سب کو اس نئی اساطیر سازی پر یقین ہو گیا ہے کہ جس طرح ان کے آباؤ اجداد ارتقا کے زور پر بندر سے انسان بن گئے، ایک روز یہ بھی بندر نہیں رہیں گے اور انسانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ یہ کیسی احمقانہ آس ہے! لیکن ہم بھی کیا کریں، بندر جاتی کا دماغ ہی اس قدر چھوٹا ہے کہ اس میں کوئی بڑا خیال سما نہیں سکتا۔ آپ نے ہمارے سر تو دیکھے ہی ہیں — چھوٹے چھوٹے ناریل۔ ایسے تنگ اور اٹھواں ماتھوں کے اندر کس قدر بائیو ٹیکلس آ سکتا ہے بھلا!"

پھر اس نے ایک زور کی ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "ہمارا ارتقا نہیں ہونے کا۔ ہم نے بندر کے بندر ہی مر جانا ہے۔ بڑی اکثریت نے لیبارٹریوں کے اندر اور اکا دکا

بندروں نے قلندروں کے پیچھے — ہمارا کچھ نہیں بنتا۔"

ہم بازیاں جانے کے بجائے وہیں سے مری کو لوٹ آئے اور راستہ بھر ایک دوسرے سے بات کیے بغیر سنگل لائن میں چلتے رہے۔ وہ دھند جو آتی دفعہ کافی دبیز تھی، اب بالکل چھٹ چکی تھی اور بڑی تیز دھوپ نکل آئی تھی۔

پہاڑوں کی تیز اور چمکیلی دھوپ سال ہا سال کے تاریک غاروں اور ٹیڑھی میڑھی پوشیدہ گھپاؤں کو آن واحد میں روشن کر دیتی ہے۔ اس وقت کچھ ایسی رمزی اور سری روشنی اتر رہی تھی کہ ہمارے قریب سے گزرنے والا ہر شخص بامعنی ہو گیا تھا!

کوٹ ودو پاور ہاؤس

یوں تو اس کا براہ راست کوٹ ادو سے کوئی تعلق نہیں تھا' لیکن ایک ہی زمین اور ایک ہی بحر میں ہونے کی وجہ سے جب بھی کوٹ ادو کا ذکر آتا' لوگ کوٹ ودو کی بات ضرور کرتے اور اس کا ذکر کرنا اب یوں بھی ضروری ہوگیا تھا کہ اتنی چھوٹی سی جگہ میں دیکھتے دیکھتے اتنا بڑا بجلی گھر قائم ہوگیا کہ جغرافیے کی کتابوں میں اس کا ذکر آنے لگا تھا اور یہ اتنا بڑا معرکہ اکیلے مسٹر رضوان نے مارا تھا۔ خیر وہ بھی کوئی خالی مسٹر رضوان نہیں تھا' انجینئرنگ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ شروع شروع میں اکیلا ضرور تھا لیکن بعد میں تو سارا گاؤں اس کے ساتھ شامل ہوگیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلا جنریٹر رضوان نے ڈیزائن کیا تھا مگر بعد میں تو گاؤں والے بھی کمزور میگنیٹک فیلڈ کا راز پاگئے۔

کوٹ ودو کے لوگوں کا خیال تھا کہ اگر صحیح طور پر طے شدہ اصولوں کے مطابق ڈائریکٹ کرنٹ جنریٹر کی بنا رکھی جائے تو یہ امدادی جنریٹر کے بغیر میگنیٹک فیلڈ کو انگیخت کرسکتا ہے۔

رضوان علی انجینئرنگ یونیورسٹی کا وہ گریجویٹ تھا جس کو سول انجینئرنگ میں ہائی سیکنڈ ڈویژن حاصل کرنے کے باوجود فوری طور پر نوکری نہ مل سکی تھی۔ رضوان کے والدین اور اس کی منگیتر اس تاخیر سے کچھ گھبرا سے گئے تھے اور اس کے ہونے والی سسرال نے شادی کی تاریخ ایک سال اور آگے کر دی تھی۔ رضوان البتہ اس بات پر خوش تھا کہ وہ قاعدے کے مطابق صرف ایک سال اور لگا کر الیکٹرک کی ڈگری بھی حاصل کرسکتا ہے۔

اصل میں اس کو ڈگری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ الیکٹرک سیمیکٹ کا بڑا شوقین تھا۔ چار سال تک اس نے پاپولر سائنس اور پاپولر میکینکس کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا تھا اور ان دونوں رسالوں کی چھ چھ مہینے کی جلدیں بندھوا کر اپنی تفریح کا مسلسل سامان کر لیا تھا۔ اس کے ذہن میں تین کیڑے ایک ساتھ گھسے ہوئے تھے: ایک تو یہ کہ وہ برانڈرتھ روڈ اور آبکاری روڈ سے پرچون کا سودا خرید کر دنیا کا سب سے چھوٹا ایٹم بم بنا سکتا ہے۔

دوسرے وہ ایسا ایندھن تیار کر سکتا ہے جس کے زور پر ڈیڑھ کلو وزنی شارٹ ویو ٹرانسمیٹر زمین کے آربٹ سے نکل کر کم از کم ایک سال تک اپنا سگنل زمین پر بھیج سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ مسلسل سال بھر تک کسی خوبصورت لڑکی کے والد کی بھینس چرا کر ٹلہ جوگیاں پر جا کے جوگ لے سکتا ہے اور دونوں کانوں میں مندرے پہن کر محبت کے پیچیدہ ترین راز سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

رضوان کا ایمان تھا کہ کائنات کی چار پراسرار زمینوں میں سے ایک زمین پاکستان کا ٹلہ جوگیاں ہے، جو جہلم کے پاس اب نندنا کے نام سے موسوم ہے۔ نندنا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر، آج سے ٹھیک ایک ہزار سال پہلے البیرونی نے زمین کے گھیر کی پیمائش کی اور پھر صدیاں گزرنے کے بعد اس ہیئت دان نے اسی جگہ کو گورو بالناتھ کے سامنے سیس نوا کر محبت کے آرکیٹکچر کا جال بننے کے لیے چنا اور اپنے قصے سے آنے والی نسلوں کے دلوں کے لاٹو روشن کر دیے۔ رضوان کا خیال تھا کہ وہ اپنے ملک میں توانائی کے ایسے سرچشمے دریافت کر سکتا ہے جن پر ایک ٹکے کی بھی لاگت نہ آئے اور جن سے کروڑوں انسان اپنی روزمرہ کی ضرورتیں کچھ خرچ کیے بغیر پوری کرتے چلے جائیں۔

نہر کا ایس ڈی او ہونے کی بنا پر سب سے پہلے اس نے بہتے پانیوں اور گرتی جھلاروں پر کچھ تجربے کیے، لیکن پہلے سے کی گئی تحقیق پر وہ کچھ بھی اضافہ نہ کر سکا۔ پھر اس نے شمسی توانائی پر توجہ دینا شروع کر دی اور نہر کے بنگلے میں دور دور تک سولر سیلوں کے فیتوں سے مڑھے تختوں کی ایک دنیا آباد کر دی۔ اس نے ترکی اور سوہاوہ

سے کوائس منگوا کر ان کے سلی کون سیل بھی بنائے اور انہیں تیز دھوپ میں رکھ کر شمسی توانائی کا انجذاب بھی کیا۔ لیکن ان کی توانائی ہندوستان اور اسرائیل میں کیے گئے تجربوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پھر رضوان نے کھیوڑے سے گہرے بھورے رنگ کے نمک کے ڈلے منگوا کر "سلی کا" کی جگہ انہیں استعمال کیا۔ اس نمک سے بنے باریک قتلوں پر اس نے ایک طرف سنکھیا اور دوسری جانب نمک کا کھلا علاقہ چھوڑ کر جب برقی رو کو جانچ کر دیکھا تو اس کی قوت ایک چوتھائی یا ایک تہائی وولٹ سے زیادہ نہ تھی، یعنی اسی قدر جس قدر "سلی کا" سے بنے سیل سے حاصل ہوتی تھی البتہ اس کے ایمپرز میں ایک ایمپئر کا اضافہ ضرور ہوا تھا۔

شمسی توانائی کو گرفت میں لینے کی منزل ابھی بہت دور تھی، لیکن رضوان کا پختہ ایمان تھا کہ قدرت کی گود میں توانائی کا ایک سرچشمہ ایسا بھی موجود ہے جس پر ابھی تک لوگوں کی توجہ نہیں گئی اور وہاں تک توجہ نہ پہنچنے کی سب سے بڑی مشکل ایک ہی تھی کہ سائنس کی دنیا کے لوگ اپنے بنائے ہوئے چوکھٹے سے باہر کسی متبادل سچائی کا یقین نہیں رکھتے اور طلسم خیال کے اور شعر شاعری کے دائرے والے لوگ قدرت کے بنیادی جوازوں کے علم سے ناآشنا تھے۔

لیکن رضوان کو یقین تھا کہ قدرت کے لامعلوم خزینہ علم کی وسیع مملکت سے ایک روز ایک چھوٹی سی حقیقت اس کی جھولی میں ضرور گرے گی... مفت، بلامعاوضہ، بغیر مشقت اور بنا ہینڈل گھمائے۔ شرط صرف لگن کی، طلب کی، دید کی اور خواہش کی تھی۔ مسلسل منہ اٹھا کر، ہاتھ پھیلا کر اور دل ہی دل میں صدا دے کر — ہولناک فقیرانہ صدا اور گرسناک عاشقانہ نگاہ!

اس نے ڈاک بنگلے کی آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر دوربین سے راجباہ کے اس کمزور مقام کی طرف دیکھا جہاں پہلے بھی دو مرتبہ شگاف دے کر لوگوں نے اپنی زمین سیراب کر لی تھی اور اب بھی وہ تین چار دن سے مقابل نظر رکھنے والے ایس ڈی او کے دفع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس وقت رضوان کو اپنی دوربین میں درختوں کے جھنڈ تلے نہر کاٹنے والا تو کوئی نظر نہ آیا البتہ کھیت کی پگڈنڈی پر بسنتی کپڑوں اور سرخ چنری میں ملبوس "چھتیس، چوبیس، چھتیس" کی شلوار جاتی دکھائی دی جس کے

ایک ہاتھ میں سٹین لیس کا ٹفن دان اور دوسرے میں ہرے پلاسٹک کا ٹھنڈے پانی کا جگ تھا۔

جب شاداں شریہہ کے نیچے بیٹھے سلیمان کے سامنے پہنچی تو اس نے ٹفن دان ایک طرف اور جگ دوسری طرف رکھ کر سلیمان کی گود میں اتنے زور سے چھلانگ ماری کہ سلیمان زمین پر چاروں شانے چت جا گرا اور اس کا سر "ٹھا" کر کے پیچھے پڑے سہاگے سے جا ٹکرایا اور اس کے سر پر لپٹا ہوا تولیہ پھک کر کے کھل گیا۔

شاداں نے اس کی ٹھوڑی پر زور سے دندی کاٹ کر کہا "کھٹی ابھی کھا جاؤں؟"

سلیمان کو ہنسی آ گئی اور اس نے مشکل سے اٹھتے ہوئے شاداں کے سر پر دھپا مار کر کہا "کچھ تو عقل کیا کر شاداں، پھر بھی ادھر ادھر کوئی دیکھ رہا ہوتا ہے۔"

شاداں نے اسی طرح گود میں بیٹھے بیٹھے کہا "ہم نے کوئی غیر شرعی کام کیا ہے جو کسی سے ڈریں!"

سلیمان سر جھٹک کر بولا "او جھلیے! غیر شرعی تو نہیں پر غیر اصولی ضرور ہے۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے!"

"اوے لوگوں کو کہنے دے سلیمان" شاداں نے اس کی چھاتی سے چمٹ کر اور کندھے پر ماتھا مارتے ہوئے کہا "لوگوں کی مانتے تو انہوں نے ابھی تک ہماری شادی نہیں ہونے دینی تھی۔"

سلیمان نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر ہاتھ بڑھا کر پلاسٹک کا جگ اٹھایا اور اس میں سے ایک گھونٹ بھر کر منہ میں چھک چھکایا اور پورا منہ ایک طرف موڑ کر کلی کی پچکاری پرے پھینکنا چاہی تو شاداں نے اپنا مہندی رنگا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔ کلی کا سارا پانی اس روک سے ایک تو دونوں کے قریب گرا، دوسرے اس کے چھینٹے لوٹ کر دونوں پر پھوار سی بن کے گرے۔

سلیمان نے زچ ہو کر کہا "تو بڑی بے وقوف ہے شاداں!" تو شاداں نے ہنس کر کہا "خالی بیوقوف ہی نہیں، بدھو بھی ہوں۔"

اب اس بات کا سلیمان کیا جواب دیتا۔ جگ زمین پر رکھ کر اپنی چھاتی سے چمٹے

ہوئے اس کے دونوں کندھے زور سے الگ کرتے ہوئے چمکار کر بولا "لے اب سیدھی ہو کر بیٹھ جا اور مجھے روٹی کھانے دے۔"

شاداں نے سر اوپر اٹھا کر کہا "تو اس طرح سے روٹی نہیں کھا سکتا بھلا!"

تو سلیمان نے سر ہلا کر ہنس کر کہا "نہیں۔"

شاداں تیزی سے اس کے بازوؤں میں گھومی اور منہ سامنے کر کے بیٹھ گئی۔ سلیمان نے اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر رکھ دی اور نماز کی نیت جیسے دونوں بازو اس کے پیٹ پر باندھ کر بولا "اچھا بھئی تیری مرضی، نہ کھانے دے روٹی۔"

رضوان نے آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھے جب دوربین میں سے یہ سین دیکھا تو اس کی جھولی میں ٹپ سے ایک آئیڈیا گرا۔ جب شیشے کی سلاخ کو ریشم کے پارچے پر رگڑا جاتا ہے تو اس میں الیکٹرونوں کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور یہ مثبت بن جاتی ہے، ادھر ریشمی پارچے میں الیکٹرون بڑھ جاتے ہیں تو وہاں منفی فیلڈ کے تیار ہونے سے شیشے کی سلاخ چارج ہو جاتی ہے — عین اسی طرح اس کا دماغ چارج ہو گیا۔

یہ اس کے تھرڈ ائیر کے زمانے کی بات ہے۔ موسم نہایت خشک تھا۔ دن بھر سخت لو چلتی رہی تھی اور آسمان پر کئی روز سے غبار کا دبیز سائبان تنا ہوا تھا۔ اپنے ہوسٹل کے چھوٹے سے کمرے میں رضوان ابھی تک چینی قالین پر اضطراب کے عالم میں چکر کاٹ رہا تھا۔ کبھی وہ پلنگ پر بیٹھ کر غصے سے غالیچے پر پاؤں مسلنے لگتا، کبھی اٹھ کر پھر چھوٹے چھوٹے چکر کاٹنے شروع کر دیتا۔

پورے تین سال تک سچی محبت کا دم بھرنے کے بعد شہلا اپنے ماموں زاد سے منسوب ہو کر جدہ جا رہی تھی جہاں اس کے والدین اس کی شادی کر رہے تھے۔ اس نے رو رو کر رضوان کے نام خط لکھا تھا اور بھاگ بھاگ کر تین دن میں جدہ جانے کی تیاری مکمل کر لی تھی!

جب رضوان نے پنجرے کے شیر کی طرح دبیز ریشمی غالیچے پر چکر لگا لگا کر شہلا کی بے وفائی کا بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اس نے اپنی رسٹ واچ اتار کر میز پر رکھی۔ جیب سے شیفرز کا قیمتی قلم نکال کر تکیے کے نیچے رکھا اور اپنے کان شنٹ کرتے اس انجن پر لگا دیے جو رات کے سناٹے میں چھجو بھگت کے چوبارے کے پیچھے

وافر سٹیم چھوڑ رہا تھا۔

اس نے خودکشی کے ارادے سے شہلا کا خط اپنی جیب میں رکھا اور رات کی تاریکی میں دروازہ کھولنے کو آگے بڑھا۔ جونہی اس کا ہاتھ پیتل کی ناب سے مس ہوا، ایک زور کا پٹاخہ چلا اور ایک شفاف شعلہ ثانئے بھر کو کمرہ روشن کر گیا۔ رضوان خوف سے کانپنے لگا اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ صاف اشارہ ہو گیا تھا کہ ابھی خودکشی کی ضرورت نہیں، معاملات خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔

معاملات تو ٹھیک نہ ہو سکے البتہ رضوان کو اس حقیقت کا اچھی طرح سے علم ہو گیا کہ اس رات پیتل کی ناب کو ہاتھ لگاتے ہی اس کی انگلیوں نے لشکارا کیوں مارا تھا اور جھٹکا کس لیے کھایا تھا!

اپنی آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھے جب رضوان ایس ڈی او نے سلیمان کی گود میں شاداں کو اس طرح بل کھاتے اور پھرکی بنے دیکھا تو لامعلوم کی دنیا سے اس کی جھولی میں ایک آئیڈیا اترا کہ اگر کسی انسان کے کھلے بازوؤں کے اندر کوئی دوسرا انسان ہلکی، بھاری یا تیز گردش کرنے لگے تو وہاں ایک الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ پیدا ہو جاتی ہے، عین اسی طرح سے جیسے آرمیچر کے اندر روٹر کے گھومنے سے برقی رو پیدا ہو جاتی ہے — انسانی برقی رو سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جیسے ہائیڈرو الیکٹرک کرنٹ سے اٹھایا جا سکتا ہے۔

ایس ڈی او رضوان نے اپنا تجرباتی بکسا اٹھایا، جیپ نکالی اور سیدھا لوکیشن پر پہنچ گیا۔ سلیمان چوکڑی مارے کھانا کھا رہا تھا، شاداں سامنے بیٹھی سلیمان کے پھٹے ہوئے صافے کو موٹے موٹے تروپے مار رہی تھی، گائے اور اس کی چھوٹی بچھیا کٹے ہوئے کھیت میں اکا دکا ڈنٹھلوں کی چرائی کر رہے تھے، رہٹ کے بیل چل رہے تھے اور جھلار سے ٹھنڈا پانی آڈ میں گر رہا تھا۔ رضوان نے اپنی جیپ ایک جھٹکے سے ان کے قریب روکی اور چھلانگ مار کر باہر نکلا تو سلیمان نے برتنوں کی طرف اشارہ کر کے کہا آؤ جی ایس ڈی او صاحب! بسم اللہ کرو۔"

رضوان نے محبت بھرے ہاتھ سے نفی کا سگنل ہلاتے ہوئے کہا "بہت بہت مہربانی، ڈھیر سارا شکریہ۔ کھانا میں نے کھایا تو نہیں، پر ابھی نہیں کھاؤں گا۔ آپ کے

ساتھ کھا لیا تو وہ روئے گا۔"

"کون بھا جی؟" شاواں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ جو میرا چوکیدار ہے' نور احمد۔ اگر وہ کھانا پکا کر رکھ دے اور میں کسی وجہ سے نہ کھا سکوں تو وہ دل ہی دل میں مجھے تین بار قتل کر کے چوتھی مرتبہ آپ خودکشی کر لیتا ہے۔"

شاواں رضوان کی اس بات پر کھل کر ہنسی اور سلیمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگی "یہ بھی میرے ساتھ کئی بار اسی طرح سے کرتا ہے۔ میں اسے قتل تو نہیں کر سکتی البتہ خودکشی ہر بار کر لیتی ہوں۔"

رضوان نے شاواں کی بات اَن سنی کر کے کہا "تم دونوں مجھ سے چھ سات برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ چھوٹے ہو۔ میں تم کو اپنے بچوں جیسے بہن بھائی خیال کرتا ہوں۔ اگر میں تم سے ایک فرمائش کروں تو پوری کرو گے؟"

فرمائش کا سن کر اور درخواست کا لہجہ جانچ کر دونوں کے چہرے پیلے پھٹک ہو گئے۔ خوف کے مارے ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور وہ احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

رضوان نے کہا "میری بھی ایک چھوٹی بہن ہے' بالکل شاواں کی عمر کی۔ اس نے ابھی ڈاکٹری پاس کی ہے اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے گھر بھر کی لاڈلی ہے۔"

شاواں کا خوف ذرا سا دور ہوا تو اس نے ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا "میں بھی چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں بھا جی اور میرے گھر والے بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

رضوان نے بھی تمہید چھوڑ کر اور دل کڑا کر کے کہا "لے پھر اگر تو میری بہن ہے اور اپنے آپ کو میری سگی بہن سمجھتی ہے تو ایک منٹ کے لیے سلیمان کی گود میں اسی طرح بیٹھ جا جیسے تو تھوڑی دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔"

ان دونوں کے چہرے ندامت' خوف' غصے اور خوشی سے سرخ ہو گئے!

تھوڑی دیر ان کو گم سم دیکھ کر رضوان نے کہا "میری اپنی بہن کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی اس لیے میں سلیمان ہی کو اپنا بہنوئی سمجھتا ہوں' اپنا چھوٹا بہنوئی ــــ"

سلیمان نے بات کاٹ کر کہا "کوئی عقل کی بات کرو ایس ڈی او صاحب! یہ کوئی منڈوہ نہیں یا فلم نہیں بن رہی کہ ہم کدکڑے مار کر اک دوجے میں لوٹنیاں کھانے لگیں۔ ہے ناں عقل نہ موت۔"

رضوان نے مایوس ہو کر کہا "میں اپنا ایک علم دیکھنا چاہتا تھا — ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا — ایک میرا خیال تھا — لیکن خیر کوئی بات نہیں — میں آپ پر زور تو نہیں دے سکتا — نہ ہی کسی مان سے کہہ سکتا ہوں — ٹھیک ہے اگر کہیں میں دور پار کا سالا بھی ہوتا — یا شاداں میری رشتے کی بہن ہی ہوتی — اور نہیں تو میرے گاؤں کی دمی ہی ہوتی تو میں اس پر آدھا پچادھا حکم ضرور چلا لیتا، لیکن اب تو کوئی تعلق ہی نہیں — " وہ مایوسی کے عالم میں اپنی جیپ کی طرف چلا تو اس کا خیال تھا کہ شاداں اسے آواز دے کر روک لے گی، لیکن شاداں نے ایسا نہ کیا۔

جب وہ واپس ڈاک بنگلے پہنچا تو چوکیدار اس کا کھانا میز پر لگا کر اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ اس نے ڈونگے سے ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ کھانا وہی تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی نسر کے چوکیداروں کو پکانا سکھائی گئی تھی.... بھنڈی گوشت، ٹینڈے گوشت، مرغی کا پیلا سالن، کچی ہلدی، کچا مسالا، کچا لسن، ساتھ توے کی بے سینکی روٹی جسے پھولنے سے روکا گیا تھا اور اس کی دو تہیں لگا کر، بھانڈ بچوں کی چھوٹی چڑاس بنا کر، دسترخوان میں لپیٹا گیا تھا۔ چینی کی رکابی میں گلابی رنگ کی وہی نیم ٹھنڈی کسٹرڈ تھی جو لارڈ میکالے کو بہت پسند تھی اور جس کا مزا چوکیداروں کی چوتھی پشت گزر جانے پر دھوبیوں کی پیچ جیسا ہو گیا تھا۔

رضوان نے آدھی روٹی کھائی اور برتنوں کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر اور ان پر دسترخوان ڈال کر لمبی آبنوسی کرسی میں دراز ہو گیا۔ اس پر کوئی علم اتر رہا تھا لیکن اس کے ذہن کی لینڈنگ سٹرپ وہم اور گمان کے کھڈوں اور کھائیوں سے پٹی پڑی تھی اور کسی قسم کا آئیڈیا اس پر بغیر کریش کیے نہیں اتر سکتا تھا۔ رضوان نے کہا "ٹھیک ہے، کریش ہی سہی!"

جب گلاب پٹواری بڑے گیٹ میں داخل ہو کر اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا تو رضوان نے کھڑکی سے اپنا چہرہ نکال کر زور سے تالی بجائی اور اونچی آواز میں کہا

"گلاب! اس وقت نہیں، پھر کبھی آنا۔ ابھی میں نے تمہارا پچھلا اندارج بھی نہیں دیکھا۔ سب کچھ اکٹھا دیکھوں گا۔ اس وقت فرصت نہیں۔ مہربانی، شکریہ۔"

گلاب پٹواری چلا گیا تو وہ پھر سوچنے لگا کہ اگر بے جان چیزیں میگنیٹک فیلڈ کے اندر گھوم کر بجلی پیدا کر سکتی ہیں تو جان دار وجودوں نے کیا قصور کیا ہے؟ اگر ان کے اندر سچ مچ کی محبت کا مقناطیسی ہالا پیدا ہو جائے تو پھر وہ کیوں چارج نہیں کر سکتیں؟

وہ ایک آخری کوشش کرنے کو سلیمان کے گھر روانہ ہوا تو راستے میں تین مرتبہ اس کا حوصلہ ٹوٹا۔ دو مرتبہ تو چاگی کمہار کے باڑے اور کچی مسجد سے واپس لوٹا لیکن تیسری مرتبہ ٹوٹے حوصلے کو پھر کندھے پر ڈال کر سلیمان کے گھر پہنچ ہی گیا۔

ادھ کھلے دروازے کے اندر اس نے دیکھا کہ شاداں گدھی کے آگے پھک ڈالنے جا رہی ہے اور اس کی بوڑھی ساس مرغیوں کے لیے آٹے کے بڑے سے پیڑے سے چھوٹی چھوٹی مروڑیاں نوچتی ڈربے کی طرف منہ کئے کھڑی ہے۔ شاداں پھک کا تسلا وہیں زمین پر رکھ کر اپنی ساس کی طرف جھپٹی اور اس کو دونوں بازوؤں میں لے کے زور زور سے گھمیٹنیاں دینے لگی۔

اول اول تو "نی شاداں.... نی دفع ہونئیں.... سورنئیں — میری جان نچوڑ دی مرنئیں — مجھے معافی دے دے —" کی آوازیں آتی رہیں لیکن پھر اس کے بعد اچانک معدوم ہوگئیں تو شاداں کے سسر نے مسجد جاتے ہوئے اپنی سوٹی وہیں ویہڑے میں پھینک کر بھاگ کے رحمتے کی جان بچائی۔

جب حاجی برکت اللہ اپنی بیوی رحمتے کو سہارا دے کر منجی کر طرف لے جا رہا تھا تو شاداں ٹپوسیاں مار مار کر پوچھ رہی تھی "ماسی حلوہ لاؤں حلوہ، باداموں اور کشمشوں والا حلوہ، جس میں اصلی کیسر بھی پڑا ہے۔"

حاجی صاحب نے ہنس کر کہا "اوئے شاداں اگر دو دفعہ اور تو نے اپنی ماسی کے ساتھ ایسا کس کے پیار کیا تو اگلی دفعہ اس کے قل ہو جانے ہیں۔"

شاداں نے کہا "ہائے میں مرجاؤں تایا جی، ماسی میں تو میری جان ہے۔ آج کے بعد ماسی کی چھٹی، آپ کی طلبی — اب میں آپ کو چک پھیریاں دیا کروں گی۔"

تایا جی حاجی برکت اللہ نے پھر ہنس کر کہا "جیسے تیری مرضی پترا۔ تیری خوشی

میں ہی ہماری خوشی ہے۔ تو چاہے ہماری جان نکال دے، سب حاضر ہے۔"

بڑا مرغا اڑ کر گدھی کی پیٹھ پر آ بیٹھا تو اس نے اتنے زور سے دولتی جھاڑی کہ پاس پڑی ہوئی جستی بالٹی میں دو گہرے چپ پڑ گئے۔ مرغا پیٹھ سے گرا نہیں، دونوں پروں کی تالی بجا کر اذان دینے لگا۔ ساس نے دور بیٹھے بیٹھے نحیف آواز میں کہا "اس کو اتار۔ پرے دفع کر۔ گدھی کی پیٹھ الی کر دے گا۔"

شاداں نے تالی بجا کر اسے اڑانے کی کوشش کی تو وہ دھب سے زمین پر گرا اور پہلو کے بل لیٹی ہوئی بالٹی کے اندر سے چنے کی دال کے موٹے موٹے دانے ٹھونگنے لگا۔

رضوان کو سو فیصد یقین ہو گیا کہ اس گھر کے اندر آپس کی محبت کا ایک مضبوط گرڈ سٹیشن قائم ہے اور یہاں سے ٹرانس مشن لائن کھینچی جا سکتی ہے۔ وہ کسی سے بات کیے اور کسی کو کچھ بتائے بنا وہاں سے بھاگ کر واپس ڈاک بنگلے پہنچا اور اپنی ساگوانی صندوقچی اٹھا کر پھر سلیمان کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

ان لوگوں کا گھر کچا تھا۔ صحن میں ایک بیری تھی۔ بیری کے نیچے گدھی بندھی تھی۔ بیس بائیس مرغیاں تھیں۔ ایک بھینس تھی۔ بلی کے دو یتیم بچے اور کٹی ہوئی دم والا ایک ڈبو تھا۔ بیری کی اوپری کھوہ میں گلہری کی رہائش تھی۔ پچھلا گلہرا یکے کے نیچے آ کر مر گیا تھا اور اب وہ ایک نیا گلہرا لے آئی تھی جو عمر میں اس سے بہت چھوٹا تھا۔ صحن کے آخر میں ایک اندھی مائی رہتی تھی جس کو سارا کوٹ ودو اماں نینا کہہ کر بلاتا تھا۔ اماں نینا کی بولی سمجھنی کافی مشکل تھی اس لیے پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اصل میں کہاں کی رہنے والی تھی۔ بیس بائیس برس پہلے اس کو حاجی برکت اللہ نہر کے پل پر سے گائیڈ کر کے اپنے گھر لے آئے تھے اور بی بی رحمتے نے اس کی سیوا داری شروع کر دی تھی۔ اتنا پتا چلتا تھا کہ نہر کے پل پر اماں نینا کو اس کا بھتیجا اور بھتیجے کی بیوی یہ کہہ کر چھوڑ گئے تھے کہ ہم تیرے لیے کسی اچھے سے ہسپتال کی تلاش میں جاتے ہیں، ہمارا انتظار کرنا۔ تین دن تک تو وہ اسی انتظار میں بیٹھی رہی، پھر اس نے کراہنا شروع کر دیا اور برکت اللہ اس کا کراہنا سن کر ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے آیا۔

سلیمان کے گھر کا باہر کا دروازہ تھا تو پرانا لیکن تھا کیل کی لکڑی کا۔ اس میں

لگے ہوئے کیل اور کوکے ابھی تک اپنی اپنی جگہ پر قائم تھے۔ پینٹ پالش نہ ہونے کی وجہ سے دروازے کی لکڑی بوسیدہ ضرور ہو گئی تھی لیکن کڑی دھوپ اور سامنے کی بارشوں کے باوصف تڑخی نہیں تھی، بائیں دروازے کی اوپر کے قلابے کا ایک آنکڑا البتہ اپنی جگہ چھوڑ کر ڈھیلا ہو گیا تھا۔ باقی سب ٹھیک تھا۔

رضوان نے ساگوانی صندوقچی کھول کر اس میں سے بکسی نکالی۔ تار کا ایک سرا اس نے دروازے کے اوپر کے آنکڑے سے لپیٹا اور بکس کی دوسری تار کو دوسرے دروازے کی آہنی چوتھی کے ساتھ باندھ دیا۔ زمین پر پڑی ہوئی بکسی کو اس نے لرزتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھا۔ اس میں پیتل کے دو ہولڈر اور مصالحے کے تین پلگ لگے تھے۔

دارے پانڈی کا ڈھلپو کتا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اماں رکھی کی بہو وہاں سے گزرتے ہوئے چور نگاہوں سے رضوان کو دیکھنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دارے کا پوتا بھی اپنے کتے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کتے سے دو تین انچ ہی اونچا تھا، لیکن انسانی بچہ ہونے کے رشتے کتے سے بہت زیادہ چالاک نظر آتا تھا۔ اس نے رضوان کو اپنے محلے میں اس طرح بے باک کھڑے دیکھ کر عجیب سا محسوس کیا، لیکن بچہ ہونے کی وجہ سے وہ اس عجیبیت کا تجزیہ نہ کر سکا اور اپنے کتے پر کہنی ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

رضوان نے گلی کے دونوں ناکوں پر سر گھما کر دیکھا اور پھر صندوقچی سے پچیس واٹ کا بلب نکال کر بکسی کے ایک ہولڈر میں لگا دیا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ چونکہ اس گاؤں کے لوگوں میں، ساری کی ساری بستی میں، سارے کے سارے لوگ ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا اور ایک دوسرے کی چاہت میں گرفتار ہیں اور سارے لوگ ایک ہی اعتقاد میں پورے کے پورے داخل ہو چکے ہیں اس لیے یہاں ایک پاور فل میگنیٹک فیلڈ کا وسیع تر دائرہ پیدا ہو گیا ہے جس میں برق کی تخلیق و تولید کا عمل جاری ہے۔

بلب لگانے کے بعد رضوان کے سر پر لاٹھی کی ایک زناٹے دار ضرب نے پہلے تو اس کا سر بھنایا، پھر اس کا اوپر کا دھڑ جھلایا اور بعد میں زانوؤں کے بل اسی طرح گرایا

جیسے جلاد گردن زدنی کو اپنی اور اس کی آسانی کے لیے بٹھایا کرتے ہیں۔

دارے کا پوتا اتنے بڑے بھائی کو گھٹنوں کے بل گرتے دیکھ کر خوف زدہ ہو کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے اس کا ڈھلپو کتا بھی حفاظت کناں کھسکا اور ساری گلی گھٹنوں کے بل گرے ایس ڈی او کے رحم و کرم پر رہ گئی۔

رضوان پر کالج کے زمانے میں مخالف سیاسی پارٹی کے لڑکوں کی طرف سے رائفل کے دستے کا شدید وار بھی سر پر ہی ہوا تھا لیکن وہ وار جسمانی ہونے کی وجہ سے اس قدر شدید نہ تھا جس قدر شدید امپیکٹ اس غیر مرئی وار کا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل، سلام پھیرنے کے انداز میں دونوں جانب دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ ہمت کر کے وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پر سرو قد کھڑا ہو گیا۔

پچیس واٹ کا بلب اپنی پوری تابانی کے ساتھ بکسی کے اندر روشن تھا اور اس کے گرد روشنی کا ایک چھوٹا سا ہالا بنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے گھر کے پھاٹک پر دونوں ٹرمینل لائیو تھے اور دونوں سے کرنٹ بدستور آ رہی تھی۔ اس نے ساگوانی صندوقچی سے اپنا چھوٹا میٹر نکال کر اس کی سرخ اور سیاہ تاریں احتیاط سے پیتل کے پلگ میں ڈال کر دیکھیں تو میٹر کی سوئی ٹک سے 220 پر جا کر رک گئی — نہ کم نہ زیادہ، نہ ہلچل نہ جھر جھر، نہ تنکے نہ جھٹکے، نہ فلکچوئیشن — ٹھیک دو سو بیس! اس نے دونوں ٹرمینلوں سے تار کھولے، اپنا سامان اٹھایا اور ڈاک بنگلے روانہ ہو گیا۔

بالکل ایسی ہی ایک رات فیراڈے پر گزری تھی... جب اس نے گھوڑا کھولنے سے قبل اصطبل سے ایک پرانی نعل اٹھا کر دیکھی تھی جس کے اندر کسی نائٹ کی تلوار کا ایک زنگ آلود چھلا آپ ہی آپ حرکت سی کر رہا تھا۔ فیراڈے نے وہ نعل اٹھائی تو چھلا ٹرک کر کے نعل کے ساتھ چٹ گیا۔ نعل مقناطیسی جا چکی تھی اور اس کے اندر کا چھلا اس مقناطیسی فیلڈ کے اندر ہل جل کر رہا تھا۔

بالکل ایسی ہی رات ایس ڈی او رضوان پر گزر رہی تھی جس کا تجربہ تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس کا سائنسی سہار نہیں مل رہا تھا۔

اس کی تھیوری یہ تھی کہ ہر انسان کی اپنی ایک میگنیٹک فیلڈ ہوتی ہے جو اس کے وجود کے گرد کافی دور تک پھیلی رہتی ہے۔ اس فیلڈ میں اس کی سوچ، خوراک،

صحت، عبادت، جنس، محبت، خلت، معاملہ فہمی اور معاملہ بندی اپنے اپنے الیکٹرونوں کی بندش کے مطابق اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ جب کسی زندہ گروہ میں یکساں مزاج، یکساں عمل اور یکساں کردار کا مظاہرہ ہو گا اور تسلسل کے ساتھ ہو گا تو اس کے اندر توانائی کے چھوٹے چھوٹے سوتے نمودار ہونے لگیں گے۔ جوں جوں جھومر ڈالتے یہ سوتے ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، ان کے مقناطیسی جذب سے توانائی کا بھنور ایک ذرہ بائین بن کر برقی رو کا مخزن بن جائے گا۔ اس پھیلتی ہوئی الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ کے کسی بھی مقام سے آمنے سامنے دو ٹرمینل فکس کر کے برقی رو کا چارج حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس بجلی اور دوسری بجلی کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ وہاں مخالف پول ایک دوسرے کے درمیان کشش کا باعث بنتے ہیں اور یہاں مطابق پول ایک دوسرے سے ہم آہنگی، ہم کاری اور ہم زوری کی وجہ بنتے ہیں۔ وہاں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک نیگیٹو پول ہو اور دوسرا پوزیٹو، لیکن یہاں یہ لازم ٹھہرتا ہے کہ دونوں ہی پول پوزیٹو ہوں ایک بھرپور پوزیٹو پول، دوسرا اس کا ہمزاد، ایسے ہی شاہل باجا۔ اس پول کی فیلڈ چاہے اتنی توانا نہ ہو لیکن اس کے الیکٹرون مقابلے میں پورے ہوں۔

رضوان نے پچیس واٹ کا بلب روشن کر چکنے کے بعد پورے تین دن کوٹ ودو کے لوگوں کا تنقیدی آنکھ سے جائزہ لیا اور ہر گروہ انسانی کو ایک پڑھے لکھے تجربہ کار انجینئر کی آنکھ سے جانچا اور ایک ماہر عمرانیات کے شماریاتی اصولوں پر پرکھا۔

کوٹ ودو کے لوگ، جانور، چرند پرند، حشرات، نباتات اس کی زہریلی گھاس پھونس اور نقصان دہ خس و خاشاک بھی پاکستان کے دوسرے علاقوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس علاقے کا ایک اپنا طلسم، ایک اپنی مقناطیسی فیلڈ اور ایک اپنا ہی کرشمہ تھا۔ جو کوئی بھی اس کے پانچ میل کے دائرے میں آ جاتا تھا اس کی کایا کلپ ہو جاتی تھی اور وہ نمبر دو سے نمبر ایک بلکہ خصوصی نمبر ہو جاتا تھا۔

یہاں کے لوگوں کو لڑنا نہیں آتا تھا شرارتیں اور چھلیں کرنے کے فن سے البتہ خوب واقف تھے۔ نفرتیں پالنے کے علم سے نا آشنا تھے لیکن بات دو ٹوک کرتے تھے۔ راجپوتی شان اور براہمنی انا سے ناواقف تھے لیکن خوبی اور خودداری کی باریکیوں

سے خوب واقف تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی ہمت اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق یہ خمیر وا اندوختہ جمع کرتا تھا اور اس کو "ہمارا اندوختہ" جان کر صرف کرتا تھا۔

سارے قصبے میں صرف تین عورتوں اور دو مردوں کی انا تھی لیکن وہ بھی بہت ہی کمزور۔ صبح گیارہ بجے تک مشکل سے بنتی لیکن شام کے پانچ بجے سے پہلے ٹوٹ جاتی۔ ایک لڑکی جس کے ننھیال چندر بنسی راجپوت تھے اور ددھیال یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، بیاہ کر جب یہاں آئی تو پہلے چند مہینے تو پوری گھمنڈن رہی، پھر اس میں بھی یہاں کے لوگوں کی خاصیتیں ابھرنا شروع ہو گئیں۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ اور ہر دم مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کے میکے کو فکر دامن گیر ہو گئی کہ لڑکی سسرال میں میکے سے بھی زیادہ خوش ہے اور اس کی وجاہت، تمکنت، حرمت اور منصب میں کمی سی واقع ہونے لگی ہے اور وہ اشرافیہ سے ہٹ کر عامیہ میں مدغم ہوتی جا رہی ہے تو انہوں نے اپنی پرانی میراثن کو بچی کی غور و پرداخت کے لیے مستقل طور پر اس کے سسرال بھجوا دیا۔ لیکن کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ میراثن ہر صبح دلہن کو اس کے میکے کی معجون نفوق کے دو بڑے چمچے ناشتے کے بعد باقاعدگی سے کھلاتی تھی لیکن بارہ بجے کے بعد دلہن کی انا بالکل ختم ہو جاتی تھی۔ جیسے چھوٹے بچے ٹارچ جلا جلا کر اس کے سیل گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ہی ختم کر دیا کرتے ہیں، کچھ ایسی ہی حرکت دلہن کی تھی۔ دلہن اپنی پندار کی ٹارچ باہر جلانے کے بجائے اندر ہی اندر اس کی بیٹری شارٹ سرکٹ سے ختم کر دیتی تھی۔ مراثن کو دلہن پر بڑا غصہ آتا لیکن اس میں قصور دلہن کا نہیں تھا کوٹ وددو کی سرزمین کا تھا۔

یہی حال دوسری عورتوں اور دوسرے مردوں کا تھا۔ وہ ہر صبح ناشتے کے بعد وٹامن انا کی ایک گولی کھا کر ناشتہ ختم کرتے تھے لیکن یہ گولی ان کے وجود پر کوئی کلٹ نہیں کرتی تھی۔ جیسے گولی کھانے سے پہلے ہوتے، ویسے ہی اس کے بعد رہتے!

انجینئر رضوان نے کوٹ وددو کی ہوا، فضا، شفتہ مزاج اور طبیعت اور گاؤں والوں کی اجتماعی سرشت اور کوٹ وددو کے جغرافیائی بہاؤ سے فائدہ اٹھا کر وہاں ایک اتھیریکل پاور ہاؤس قائم کر دیا جو لوگوں کی آپسی محبت کے جزیشن ہونے سے بجلی پیدا کرتا تھا۔ اس نے کوٹ کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے گرڈ سٹیشن قائم کر کے ان

کے نام گرڈ سٹیشن شرقی اور گرڈ سٹیشن غربی رکھ دیے۔ ان گرڈ سٹیشنوں سے قصبے کے لیے ٹرانس مشن تاریں چلتی تھیں اور دیواروں، ممٹیوں اور چھتوں پر لگے ہوئے بانس اور لکڑی کی بلیاں کھمبوں کا کام دیتی تھیں اور یہیں سے سارے گھروں اور دکانوں کو بجلی کے کنیکشن ملے ہوئے تھے۔

ان دونوں گرڈ سٹیشنوں کے درمیان حیاتو کا پرانا باڑہ تھا جہاں وہ اپنی بھیڑ بکریاں بند کیا کرتا تھا۔ دور دور سے بکریوں کے بیوپاری اور نامور قصائی حیاتو سے دیسی بکریاں خریدنے آتے تھے اور منہ مانگی قیمت دے کر جاتے تھے کہ قرب و جوار کے تاریخی ٹیلوں کی بوٹیاں چر کر ان بکریوں کا گوشت زعفران جیسا خوشبودار ہو گیا تھا۔ ایک روز حیاتو اپنی ساری بھیڑ بکریاں گاؤں والوں کے حوالے کر کے زیارتوں پر چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا.... کہہ کر گیا تھا کہ اگر چھ مہینے کے اندر اندر واپس آ گیا تو سب کچھ میرا، نہیں تو گاؤں والوں کا۔

حیاتو لوٹ کر نہیں آیا تو یہ باڑہ ویران ہو گیا۔ بھیڑ بکریاں حسب وصیت گاؤں والے اپنے استعمال میں لے آئے لیکن حیاتو کے باڑے کی جگہ ویسی کی ویسی پڑی رہی۔ نہ کسی نے اس پر قبضہ کیا اور نہ ہی اسے شاملات بنایا گیا۔ یہ مستطیل ٹکڑا اسی کے نام پر چلتا رہا اور اب جب انجینئر رضوان کو اس کی ضرورت پڑی تو اس نے اس باڑے کے ٹوٹے ہوئے بانسی پھاٹک پر "ودو پاور ہاؤس" کا بورڈ لگا دیا۔

چار مہینے تک بجلی گھر میں مسلسل تجربے کرنے اور ہر بار ان کے خاطر خواہ نتیجے برآمد ہونے کے بعد ایس ڈی او رضوان نے اپنے دونوں نہری پٹواریوں، ایک ضلع دار اور شہر سے بلوائے ہوئے اپنے کلرک کی مدد سے بجلی گھر میں ٹرمینلوں، سوئچوں، فیوز بورڈوں اور ڈسٹری بیوشن پینلوں کو بڑے سلیقے اور بڑی خوش خطی کے ساتھ دیواروں کے ساتھ فکس کر دیا۔ کوٹ کے لوگ بجلی گھر میں کام کرتے الیکٹریشنوں کے لیے ستو، لسی، روٹی پانی، چائے اور راتوں کو اوور ٹائم لگانے پر گرم دودھ اور چاول کے مرونڈے بھی فراہم کرتے رہے اور فراغت کے موقعوں پر آ کر ان کا دل بھی بہلاتے رہے۔ ان دل بہلاوہ میٹنگوں میں گندے لطیفے، خادم کے کبت، میاں محمد کا کلام، احوال الآخرت کے بند، مکے مدینے کے سفر کے واقعات اور ہیو سارو کے ادھلنے کی کہانی کے تینوں رخ

شامل ہوتے تھے۔

ایک شام رضوان صاحب ایس ڈی او نے گاؤں کے سب لوگوں کو بجلی گھر کے سامنے جمع کر کے اعلان کیا کہ کوٹ ودو کا اتھیریئل پاور ہاؤس تیار ہے اور آج رات اس کو چالو کر دیا جائے گا۔ سب لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور اضطرابی جوش کے چیخ دار نعروں سے سارا گاؤں سر پر اٹھا لیا — لیکن —

"لیکن" انجینئر رضوان نے اپنی مخصوص نیم نسوانی آواز میں کہا "آپ لوگوں کو زندگی بھر اسی طرح سے رہنا ہو گا جس طرح سے آپ آج تک رہتے آئے ہیں اور اپنے درمیان محبت، چاہت، لطف اور کرم کو کم نہیں ہونے دینا ہو گا۔ میں نے اپنی مشینوں سے اور بہت ہی حساس آلات سے اس حقیقت کی تحقیق کر لی ہے کہ کوٹ ودو اور اس کے ارد گرد کا علاقہ، اس کے کھیت اور کھلیان اور اس کے راستے اور راجباہے ایک بہت ہی بڑا مقناطیسی حصار ہیں اور اس یونٹ کے اندر آپ لوگوں کا اجتماعی وجود ایک روٹر کی حیثیت سے گھوم رہا ہے۔ آپ لوگ اپنے درمیان ایک دوسرے سے بے پناہ محبت رکھنے کی وجہ سے توانائی کے ایسے یونٹ بن گئے ہیں جن کو بجلی جنریٹ کرنے کے لیے کسی قسم کے ایندھن کی یا باہر کی طاقت کی مطلق ضرورت نہیں۔ آپ کم ازکم اپنے علاقے کی بجلی کے لیے خود کفیل ہیں اور اسی خود انحصاری کی بدولت آنے والی صدیوں تک اسی طرح سے بجلی پیدا کرتے چلے جا سکتے ہیں بشرطیکہ۔"

یہاں آ کر رضوان صاحب خاموش ہو گئے۔ سب لوگ انتہائی خاموشی کے عالم میں خوف زدہ ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگے۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح گم سم کھڑے رہنے کے بعد رضوان ایس ڈی او نے کہا "بشرطیکہ تم اپنے درمیان محبت کے موجودہ خزانے ختم نہ ہونے دو اور انسانی چاہت کے دفینوں میں کمی نہ آنے دو۔ تمہارے چہرے اسی طرح بشاش، دل اسی طرح مسرور اور روحیں اسی طرح شاداں اور فرحاں رہیں۔ اگر آپ کے ذہن سے اٹھنے والے شیشہ دل کے اندر ذرا سا بھی بال آ گیا اور اس میں آنٹ، عداوت، حسد، جلن کا غبار اپنی جھلک دے گیا تو پھر تمہارا سارا علاقہ گھپ اندھیرے میں اور تمہارے اپنے اندر گہری تاریکی میں ڈوب جائیں گے۔ لاگ لپٹ اور کرودھ کپٹ کے ذرا سے چسکے کے بدلے بھری بہاروں اور ہنستے گلستانوں کا سودا نہ کر

لینا۔ ایک بار آئی ہوئی خزاں نے پھر واپس نہیں جانا۔"

لوگوں نے ہاتھ، لاٹھیاں، ڈنڈے اور عصے اوپر اٹھا کر کہا "سن لیا اور مان لیا۔ ہم جاننے والے لوگ نہیں، ماننے والے لوگ ہیں۔ یقین والے لوگ ہیں۔ ایمان والے لوگ ہیں۔ ایمان والے ساتھی ہیں۔"

ایس ڈی او رضوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر ہجوم سے اماں چراگو بھڑبھونجن کی کلائی پکڑ کے اسے باہر کھینچا اور باڑے کی دیوار سے کسے ہوئے بڑے سارے سوئچ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اماں چراگو اتنے سارے لوگوں کے سامنے کچھ شرمائی اور بہت ساری گھبرائی سی کھڑی تھی۔ رضوان نے کہا "لے اماں، بسم اللہ کر کے اس سوئچ کو اوپر اٹھا دے۔"

اماں چراگو نے سر پر دوپٹے کی بکل دوہری کر کے "بسم اللہ" کہا اور سوئچ اٹھانے کے لیے زور لگایا لیکن اس سے سوئچ اٹھایا نہ گیا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے رضوان کی طرف دیکھا تو رضوان نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اماں نے اپنی ترخی جلد والا ہاتھ راکھ بھری مٹیالی چیکٹ آستین پر رگڑا اور ایک مرتبہ پھر "بسم اللہ" کہہ کر سوئچ کی سیاہ چمک دار ہتھی کو پورے زور سے اوپر اٹھایا تو سوئچ کا "یو" پہلے کے مقابلے میں کافی اوپر اٹھ گیا۔ کافی اوپر اٹھنے سے حوصلہ پا کر اماں نے اپنے کندھے کی اڑیس دے کر سوئچ کھڑانک سے پورا اوپر اٹھا دیا اور اس کھڑانک کی آواز کے ساتھ ہی سارا کوٹ ودو بقعہ نور بن گیا۔ لوگوں کے منہ سے بے اختیار "سبحان اللہ" کی چیخ نکلی اور پھر "سبحان اللہ سبحان اللہ" کے آوازے بڑے بڑے مرغولوں کی صورت میں سارے مجمع کے اندر گھومنے لگے۔ ان گردابوں کے اندر مولوی صاحب نے اپنی غیر مترنم آواز میں دہقانی طرز کی قرات شروع کر دی جس کا مطلب تھا:

خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے
اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے
چراغ ایک قندیل میں ہے
اور قندیل ایسی گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے
اس میں ایک مبارک درخت زیتون کا تیل جلایا جاتا ہے

یہ نہ مشرق میں ہوتا ہے اور نہ مغرب میں
اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے پھر بھی جلنے کو تیار ہے
روشنی پر روشنی
خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے
اور خدا جو مثالیں بیان فرماتا ہے تو لوگوں کے لیے
اور خدا ہر چیز سے واقف ہے!

پھر گاؤں کے نمبردار نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "کوٹ وددو کے لوگو! اللہ نے تم پر بہت بڑا اکرام کیا ہے کہ تم کو ایسے نور سے نوازا ہے جس پر ایک پیسے کی لاگت بھی نہ اٹھے۔ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر واجب ہے کہ ہم ساری رات اس کی حمد و ثنا کریں اور اس کے محبوب کے گن گائیں۔ آج رت جگا ہو گا اور ہم سارے یہیں قیام کریں گے، سوائے ان بیبیوں کے جن کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور جن کے کچھ گھریلو کام رہ گئے ہیں۔"

مولوی صاحب نے اٹھ کر کہا "بے شک نمبردار صاحب کی بات سولہ آنے اور چالیس سیر درست ہے اور ہم کو ہر وقت اپنے خالق کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیے لیکن دوستوں سے ملنا، عزیزوں رشتہ داروں کی تکریم کرنا اور صلہ رحمی ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ آج کی رات خوشیوں کی اور مہربانیوں کی رات ہے اس لیے ہم ایک دوسرے کے درمیان خوشیاں تقسیم کریں گے اور مہربانیوں کی پھوار سے ایک دوسرے کو بھگو کر ٹھنڈک سے مالا مال کر دیں گے۔"

نمبردارنی بولی "ہم عورتیں مال پوئے، حلوہ، میٹھی روٹیاں اور گڑ کے گلگلے پکائیں گی اور نمبردار سر پر پرات رکھ کر اور آواز لگا کر انہیں دور دور بیٹھی ٹکڑیوں میں تقسیم کرے گا اور جو بی بیاں اس وقت بچوں کے ساتھ گھروں میں ہیں، ان کے لیے نمبردار یہ سوغاتیں اپنی بیٹی اور بھانجی کے سروں پر رکھ کر گھر گھر پہنچائے گا۔"

نمبردار نے کہا "مجھے منظور ہے!"

پھر نوجوان ہزار ہزار کینڈل پاور کی بتیوں تلے پنجہ لڑانے، بینی پکڑنے اور گن کر ڈنٹر لگانے لگے۔ لڑکے "اپچنا من میچنا" اور "محمود کا ٹو" کھیلنے لگے۔ لڑکیاں گدے کے

جھومر میں بیٹھ کر کر تھال ڈالنے لگیں اور بڑی عورتیں اینٹیں جوڑ کر چولھے سلگانے لگیں۔

کامے مرد تو اپنے کھڑے زانوؤں اور کمر کے گرد پٹکے ڈال کر چپ چاپ بیٹھ گئے لیکن سفید اور کھچڑی ڈاڑھیوں والے بزرگ شرارتی موڈ میں اتر کر ایک دوسرے کو مخول کرنے لگے۔ بلبوں کی دودھیا روشنی میں ان کے گندم گوں سرخ چہرے شب برات کے پٹاخوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جن کے پھٹنے میں ذرا سی کسر باقی رہا کرتی تھی۔ مولوی صاحب میٹھی روٹی کے انتظار میں اپنی جوانی کا قصہ سنا رہے تھے جب وہ برساتی نالے سے سیر بھر گول گول پتھریاں اٹھا اٹھا کر کھا جاتے تھے اور اوپر سے پاؤ بھر آٹا پانی میں گھول کر پی جاتے تھے۔ نہ بھوک نہ پیاس، دو دو دن اچھے خاصے گزر جاتے اور صبح حاجت کے وقت پتھریاں صحیح سلامت برآمد ہو جاتیں۔

صبح چار بجے جب سب لوگ مال پوئے، میٹھی روٹیاں اور گڑ کے گلگلے کھا کر غٹ ہو گئے اور نمبردار نے پکار کر کہا کہ اس کو سحری جان کر شکرانے کا روزہ ہی رکھ لیں تو مولوی صاحب نے کہا "اب تو سفید دھاگے اور کالے دھاگے کا ملاپ ختم ہو گیا نمبردار جی، اب تو دونوں ہی سفید دھاگے ہیں۔ وقت گزرنے کے بعد نیت کرنے سے روزہ مکروہ ہو جائے گا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے!"

جو لوگ زیادہ پیٹ بھر جانے سے زمین پر ہی لم لیٹ ہو گئے تھے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "اب ہماری مرضی نہیں مولوی جی، ٹھہر کے سہی۔ اس جمعرات کو روزہ رکھیں گے اور یہ ہے بھی نوچندی جمعرات۔"

کوٹ ودو کے بجلی گھر کی خبر دور دور تک پھیل گئی اور لوگ یکوں پر، ریڑھوں پر اور ٹریکٹروں پر دور دور سے آنے لگے اور اس انوکھے بجلی گھر کو دیکھنے لگے۔ گاؤں والوں نے باہر شاملات میں ایک بڑا تنبو تان دیا تھا اور اس کے نیچے چارپائیاں ڈال دی تھیں۔ جو کوئی بھی آتا، اسے کھانا کھا کر اور دو گھڑی آرام کر کے جانے کی اجازت ملتی تھی۔ سواریوں کے لیے گھاس دانے کا الگ انتظام تھا۔ نوجوان لڑکے دور سے آنے والے گھوڑوں کی مالش کرتے، پھر ان کے منہ پر توبڑے چڑھاتے تھے۔ بہت دور سے آنے والی ڈاچیوں کو شکر اور پھٹکڑی کے پانی کی بالٹیاں تیار ملتیں۔ لوگ نہاتے بھی، کھانا

بھی کھاتے اور حقہ بھی کھینچتے اور ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتے کہ ہماری بستیوں میں ایسے بجلی گھر نہیں لگ سکتے! لیکن پھر خود ہی اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ اتنی دشمنائیاں، اس قدر آنٹھ عداوت اور آپس میں اتنی مقدمے بازیوں کے ہوتے ہوئے بجلی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے! کئی ایک سمجھ دار لوگوں نے واپس جا کر گاؤں میں پنچائتیں بھی کیں، پرانے بیریوں کو سمجھایا بجھایا بھی، ان کو مفت کی بجلی کے فوائد سے بھی آگاہ کیا لیکن ان میں صلح صفائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور قدیمی عداوتوں کی وجہ سے بجلی گھر کا منصوبہ ویسے کا ویسا رہ گیا۔

ماسٹر کریم بخش تیلی بی اے بی ایڈ، کوٹ ودو ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ تھے تو نوجوان اور تھے بھی خوبصورت لیکن اپنے نام کے ساتھ تیلی ضرور لکھتے تھے۔ مستقیم خان نائب تحصیل دار، یاسین ذیل دار، محمد امین نمبردار اور گاؤں کے دیگر معزز لوگوں نے کئی مرتبہ سمجھایا کہ ماسٹر صاحب اپنے نام کے ساتھ تیلی نہ لکھا کریں، اس طرح علم کی توہین ہوتی ہے لیکن وہ نہیں مانے اور اسی طرح لکھتے رہے۔ ایک مرتبہ بڑے بزرگوں کے کہنے پر ایس ڈی او رضوان نے بھی ان پر زور دیا کہ وہ اپنے اس لاحقے کو چھوڑ دیں لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب نے معذرت کر لی اور بتایا کہ ان کی ساری سندوں پر اور ڈگریوں پر بھی ان کے نام کے ساتھ تیلی چھپا ہوا ہے اس لیے وہ اپنے نام کے اس لاحقے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ پھر انہوں نے تفریح کی گھنٹی میں سینکڑوں لڑکوں کو شور مچاتے، کدکڑے مارتے اور درختوں سے جھولتے دیکھ کر ان کی طرف اشارہ کیا اور محبت سے کہا "رضوان صاحب! یہ سارے مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور مجھے تیلی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں ان سے یہ رحمت بھرا لفظ چھین کر کس لیے ان کو اس نعمت سے محروم کر دوں۔ یہ مجھے اپنی جان سے بھی پیارے ہیں۔"

جب ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب کے والد فوت ہوئے تو کریم بخش کی عمر دو سال کی اور اس کی چھوٹی بہن رضیہ کی عمر ایک سال کی تھی۔ ان دونوں کی والدہ ٹھیک انیس سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں اور انیس سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک اکیلی کولھو چلا کر کچی گھانی کا تیل نکال کر بیچتی رہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے تین بیل بھی خریدے اور اپنے دونوں بچوں کی شادی بھی بڑی دھوم دھام سے کی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب

کو اپنی نیک نیت، محنتی اور ہنس مکھ والدہ سے اس قدر پیار تھا کہ انہوں نے اپنی اماں کے چیٹے کو اپنے نام کا ایک جزو بنا لیا تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ اس جزو کی وجہ سے ان کی والدہ کی روح ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے اور سکول کے سارے کاموں میں ان کی مدد کرتی ہے۔ اس روح سے مدد حاصل کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے گرد ایسے استادوں کا حصار قائم کرلیا تھا جو مزاج کے سخی، طبیعت کے غنی اور فرائض کی بجا آوری کے کمانڈو تھے۔

ماسٹر منظور ریاضی کے اور ماسٹر اشتیاق اُردو فارسی کے اُستاد تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی جان تھے اور ہر وقت اکٹھے رہتے تھے۔ پانچ کمرے کے بورڈنگ ہاؤس میں ان دنوں اُستادوں کی وجہ سے بتیس طالب علم رہائش پذیر تھے اور ساٹھ روپے مہینے میں دو وقت کی اچھی روٹی کھاتے تھے۔ ماسٹر منظور چپاتی بھی بنا لیتے تھے اور خشکہ چاول بھی تیار کر لیتے تھے۔ ماسٹر اشتیاق ترکاری بنانے کے ماہر تھے۔ گُو کے باڑے کی سبزی، خوشی محمد کے گھر کا خاص گھی اور کرم علی کی دکان کا نمک مرچ اور گرم مصالحہ..... یہ سب چیزیں تحفتہً آتی تھیں اور ماسٹر اشتیاق کی تحویل میں پہنچ جاتی تھیں۔ اُنہوں نے نویں جماعت کے تین طالب علم ایسے مسالچی تیار کیے تھے کہ ماسٹر صاحب کی غیر موجودگی میں سالن کا دیگچہ بھی بنا لیتے تھے۔ ہر جمعرات کو ڈرائنگ ماسٹر خرم مسیح ولائتی پڈنگ بنا کر اس پر دیسی پستے کی ہوائیاں اس خوبی سے نچھاور کرتے تھے کہ مشرق مغرب یک جان ہو جاتے تھے۔

ہیڈ ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب نے ایک روز رضوان صاحب کو سکول کے سامنے روک کر کہا "آپ ایک مرتبہ چیک کر کے ددو پاور ہاؤس کی وولٹیج تو معلوم کریں۔ شاید بیچ بیچ میں سے ٹوٹتی ہو۔"

رضوان نے حیرانی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا تو اُنہوں نے کہا "ہمارا چپڑاسی الطاف ذرا بدنیت سا آدمی ہے۔ کام تو ٹھیک ٹھاک کرتا ہے، لیکن دل کی خوشی سے نہیں کرتا۔ اس کا ضرور اثر پڑتا ہو گا۔ میرا خیال ہے بہت سی کرنٹ نیوٹرلائز ہو جاتی ہو گی۔"

رضوان نے کہا "آپ فکر نہ کریں، میں کل صبح سویرے چیک کر لوں گا۔ دس

بجے ایک موگھے کی شکایت سننے جانا ہے۔ صبح دُعا کے وقت آجاؤں گا۔ اس وقت سارے اُستاد اور طالب علم ایک ہی جگہ موجود ہوں گے۔"

ہیڈ ماسٹر نے ایس ڈی او صاحب کو موتیے کا وہ پھول پیش کیا جو اُنہوں نے اپنے دفتر کے آگے سے توڑا تھا اور جس کو وہ دس بارہ مرتبہ سونگھ چکے تھے۔ ایس ڈی او رضوان نے پھول لے کر اپنی عینک کی کماتی تلے دائیں کنپٹی کے پاس دبا لیا اور شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا۔

حیدر والا، گلو کے اور روالیاں گاؤں نے یکے بعد دیگرے کوٹ ودو کے بجلی گھر کو چار چار عرضیاں گزاری تھیں کہ اُنہیں بھی بجلی کا کنیکشن دیا جائے اور جو ریٹ سرکار کا ہے، اس کے مطابق خرچہ لیا جائے لیکن کوٹ ودو الیکٹرسٹی کمیٹی نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ روالیاں گاؤں چونکہ بالکل سامنے دو میل کے فاصلے پر تھا اس لئے اس کا حق فائق تھا۔ لیکن وہ دو چکیوں، ایک روئی پینجنے کی مشین اور لکڑی اور لوہے کی تین خرادیں چلانے کے لئے دس ہارس پاور کی موٹر کا کنیکشن بھی مانگتا تھا، اس لئے کمیٹی نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ رضوان کا خیال تھا کہ حیاتو کے باڑے کا گرڈ سٹیشن اتنے لوڈ کا متحمل نہیں ہو سکتا، اس لئے فی الحال ہر درخواست سے معذرت کر کے ہی گزر جانا چاہیے۔

سکول کے خوبصورت باغیچے میں ہیڈ ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب تین سیڑھی اُونچے منبر پر سر جھکائے کھڑے تھے اور اُن کے گرد اُن کا سٹاف ادب اور انکسار کے ہاتھ سینے پر باندھے نیم دائرے کی شکل میں موجود تھا۔ لڑکے لہک لہک کر "لب پہ آتی ہے دُعا" گا رہے تھے اور سارا گاؤں اس نیلگوں نغمے کی لپیٹ میں انڈوں پر بیٹھی کبوتری کی طرح شانت اور پُرباش تھا۔

ایس ڈی او رضوان نے کسی کی توجہ بٹائے بغیر جب باغیچے کے آہنی قوس والے جنگلے کے نیچے کھڑے ہو کر وہاں سے پیدا ہونے والی بجلی کو جانچنے کی کوشش کی تو وولٹ میٹر کی سوئی زور سے جھلملا کر اور موت کا سا جھٹکا کھا کر زیرو پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ رضوان نے جلدی سے میٹر کی ناب دو ڈگری اُوپر چڑھا کر پھر چیک کیا تو خوشی کے مارے اس کے منہ سے ایک بے ہودہ سی چیخ نکل گئی۔ میٹر چار سو چالیس وولٹ دکھا

رہا تھا۔

باغیچے کے دوسرے کونے میں آہنی جنگلے سے تیس ڈگری کے زاویے پر 440 وولٹ کا ایک نیا گرڈ سٹیشن "سکول گرڈ نارتھ چار سو چالیس وولٹ" قائم کیا گیا۔ روالیاں والوں کو اطلاع کر دی گئی کہ وہ مضبوط کھمبے اور نئی تاریں ڈال کر 440 کا کنکشن لے لیں اور اپنے سکول کے ساتھ ایک سب سٹیشن قائم کر لیں۔

روالیاں والوں نے اعلیٰ درجے کے پانچ ڈھول اور دس بھرائی منگوا کر اپنے گاؤں میں چھنج ڈال دی۔ نوجوان بھنگڑے کے مقابلے کرنے لگے اور لڑکیاں سکول کی دیوار سے چادریں اور کھیس باندھ کر اُن کی اوٹ میں گدا ناچنے لگیں۔ نمبردار نے آرڈر بول دیا کہ لڑکیاں ناچیں ضرور..... خوشی کا دن ہے، پر گیت کے بول نہیں اٹھائیں گی..... گدے کے ساتھ بھرے منہ کی پھونک سے پھر پھر کی پھرت بے شک دے لیں۔ بھنگڑے والے جوان پردے کے اس پار ڈھیلے ہونٹوں کی پھر پھر اور گدے کی باج سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں کون سی بولی گا رہی ہیں، وہ اس کے جواب میں اگلی بولی شروع کر دیتے تھے۔ صبح چار بجے جب گانا بجانا ختم ہوا تو رات کے گئے روالیاں کے ٹریکٹر ٹیلیفون کے استعمال شدہ کھمبے اور تاروں کے بڑے بڑے لچھے لے کر گاؤں کی سرحد میں داخل ہو رہے تھے۔

تین دن کے اندر اندر روالیاں گاؤں کو کوٹ ودو پاور ہاؤس سے چار سو چالیس کا کنکشن مل گیا اور اُن کی آٹے کی ایک چکی چالو ہو گئی۔ ہفتے کے اندر اندر خرادیوں اور روئی پینجنے والوں نے بھی ٹمپریری چھپر ڈال کر اپنا کام شروع کر دیا اور دونوں مسجدوں نے گھروں کو روشنی ملنے سے بارہ گھنٹے پہلے اپنے اپنے لاؤڈ سپیکر کا بندوبست کر لیا اور یوں موضع روالیاں بجلی والے دیہات کی صف میں آ گیا۔

کوٹ ودو کا بجلی گھر چالو ہونے سے یہاں کے لوگوں کی زندگی میں ایک عجیب طرح کا انقلاب آ گیا۔ پہلے اگر اُن کے درمیان تھوڑی بہت اُڑ پس اور چھینا جھپٹی تھی بھی تو وہ بالکل ختم ہو گئی۔ اس گاؤں کے رقبے چونکہ بہت بڑے نہیں تھے اور کوئی خاص جاگیردار اس علاقے کا تھا نہیں، اس لئے لوگوں کے درمیان بھائی چارے کا رشتہ قائم تھا۔ بس تین چار لڑکے دوسروں کی شہ پا کر اور ارد گرد کے لوگوں کی خرمستی کا

نظارہ پا کر دوبئی چلے گئے تھے مگر جلد ہی لوٹ آئے کہ وہاں اُن کا دل نہ لگا اور سکوں کی لین دین ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ واپسی پر گھر والوں نے کچھ کہا نہ گاؤں والوں نے طعنہ زنی کی۔ اپنے اپنے عشق جہاں چھوڑ کر گئے تھے، وہیں سے پھر شروع کر لئے اور اُن کی محبوباؤں نے پوچھا تک نہیں کہ ہمارے لئے بدیش سے کیا تحفہ لے کر آئے ہو! ایسے محبت بھرے انسانی گروہ کے اندر گرم جوشی کے اٹوٹ تسلسل سے بجلی کا پیدا ہونا ناگزیر تھا لیکن اُسے دیکھنے والی آنکھ کی اور موقع پر پکڑنے والے دماغ کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں بہ یک وقت ایس ڈی او رضوان کی تحویل میں دے کر اس کے مقدر کی ہنڈی لکھ دی گئی تھی۔

جب یہ خبر ولایت کے اخباروں میں چھپی کہ پاکستان کے ایک گاؤں میں انسانی رشتوں کے بھرپور تعاون سے اور بنی نوع انسان کی آپس کی بے لوث محبت سے الیکٹرک سٹی پیدا ہونے لگی ہے اور اس بجلی سے وہ سارے کام لئے جا رہے ہیں جو تھرمل یا ہائیڈرو یا ایٹمی بجلی گھروں میں پیدا ہونے والی بجلی سے لئے جاتے ہیں تو الیکٹرک انجینئروں کے گروہ جوق ور جوق اس فنومنن کا مطالعہ کرنے کے لئے کوٹ ودو پہنچنا شروع ہو گئے۔

مہمانوں کی آمد اور اُن کے قیام کے لئے کوٹ ودو میں ایک چھوٹا سا مہمان خانہ تعمیر کیا گیا۔ بڑی سڑک سے ملانے والی کوٹ ودو روڈ کو کارپٹ کیا گیا۔ ولائتی طرز کا ایک ایئرکنڈیشنڈ ریستوران بنایا گیا جس میں ہر وقت لوک دھنیں بجا کرتیں۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ٹورسٹ گائیڈ بن کر گٹ مٹ، پٹ پٹ انگریزی بولنے لگے لیکن اُن کی انگریزی بجلی گھر کی تاریخ، اس کے آثار، اس کی اختراع اور اُس کے وجود میں آنے تک محدود تھی۔ اس کے علاوہ اگر ٹورسٹ کو کچھ اور پوچھنا ہوتا تو اُسے سکول جا کر ہیڈ ماسٹر کریم بخش تیلی صاحب سے رابطہ کرنا پڑتا تھا۔

امریکی سائنس دان اس حیرت انگیز اختراع کے پیچھے پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں کے راز دریافت کر رہے تھے۔ ایف بی آئی اور سی آئی اے کے جتنے بھی اہل کار ماہرین کے روپ میں یہاں آئے تھے، اُن کو یقین تھا کہ اس دھوکے کی ٹٹی کے پیچھے ایک بہت بڑا آتش فشاں پاکستانیوں کے تصرف میں آگیا ہے اور جس طرح اُنھوں نے

آگے بڑھے بغیر پیچھے ہی پیچھے سے سوویٹ روس کو چاروں شانے چت گرا دیا تھا اسی طرح سے کسی روز یہ مغربی دُنیا کو بھی پوپلے منہ کی ڈاڑھ کی طرح کھوکھلا کر دینے والے تھے۔ اُنہوں نے فوراً فیکس بھیج کر کوٹ ودو کے لئے تین کثیر المقدار رقوم کی امدادیں منگوائیں جن میں سے ہر ایک ایڈ چالیس اُونٹوں پر لد کر آئی تھی اور کاغذی نوٹوں کے بجائے سونے کی اینٹوں پر مشتمل تھی۔ ایک امدادی رقم کوٹ ودو کے اندر پولیوشن دُور کرنے کے لئے تھی، دوسری اس گاؤں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے تھی اور تیسری کوٹ ودو کے نوجوانوں سے نشے کی لعنت دور کرنے کے لئے تھی۔ امریکی ماہرین نے چالیس دن کا چلہ کاٹ کر ان اعداد و شمار کی فوٹو کاپی ہر شخص کو فراہم کر دی تھی کہ کوٹ ودو کا ہر تیسرا شخص ہیروئن کا عادی ہے اور وہ ایک دن میں ایک سو چھپن روپے کی ہیروئن استعمال کرتا ہے۔

کوٹ ودو کا نمبردار کھلے میدان میں حیران پریشان کھڑا تھا اور اس کے سامنے خزانوں سے لدے چالیس چالیس اونٹوں کی تین قطاریں کھڑی تھیں۔ امریکی سفیر اسلام آباد سے اور سیکرٹری آف سٹیٹ واشنگٹن سے آ کر نمبردار کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور اس کے ارشاد کے منتظر تھے۔ نمبردار نے ترجمان کی طرف منہ کر کے پہلے تو اپنے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر درد بھرے لہجے میں کہا "ان سے فرما دیجئے کہ ہمارا سارا گاؤں اُن کی توجہ، اُن کے تعلق اور ہمارے بارے میں اُن کے لطیف احساسات کا تہ دل سے شکر گزار ہے۔ سونے کی اینٹوں سے لدے ہوئے اونٹ جو انہوں نے ہماری مدد کے لئے عطا فرمائے ہیں، فی الحال ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے کہ کوٹ ودو میں پولیوشن نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ جب سے ہم نے اپنی بجلی پیدا کرنی شروع کر دی ہے، ہماری آنکھیں دھوئیں کو اور ہمارے سانس گرد کو ترس گئے ہیں۔ چند ماہ پہلے تک اماں صالحہ کے تنور اور مائی بھڑبھونجن کی بھٹی سے دھوئیں کے کچھ آثار نظر آ جاتے تھے لیکن اب اُنہوں نے بھی بجلی کی بھٹیاں لگالی ہیں۔ جگہ جگہ ٹیوب ویل لگ جانے سے سبزی اور سرسبزی گھروں کے اندر تک پھیل گئی ہے اور دھول کے تمام آثار مٹ گئے ہیں۔ چار پانچ روز پہلے لڑکے لڑکیاں مکئی کے کچھ بھٹے جمع کر کے چوک میں لے آئے تھے لیکن اُنہیں بھوننے کے لئے ان کے پاس آگ نہیں تھی۔

شرفو ڈرائیور بڑی وین لے کر شہر گیا اور وہاں سے ایک کلو کوئلے لے کر آیا۔ وہ کوئلے چوک میں دہکائے گئے تو سارا گاؤں باہر نکل آیا اور ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر کاربن مونو آکسائیڈ کا آدھا آدھا گھونٹ نتھنوں میں کھینچ کر مشکل سے پرانی پولیوشن کی یاد تازہ کر سکا۔ ان کوئلوں سے بڑی مشکل کے ساتھ تین بھٹے بھونے جا سکے ...... چنانچہ میں درخواست گزار ہوں کہ پولیوشن کی کم یابی بلکہ نایابی کی وجہ سے یہ امداد واپس لے لی جائے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

گاؤں کے لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور لڑکوں نے منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیوں کا بازار گرم کر دیا۔ اماں رابیاں نے اپنی لاٹھی ہوا میں گھما کر کہا "وے منڈیو! مجھے سونے کی اینٹ ایک مرتبہ دکھا تو دو۔ میں نے تو آج تک دیکھی ہی نہیں۔ ایسے ہی ناں سارے اونٹ واپس کر دینا۔"

لڑکے موٹی موٹی تالیوں کی تھاپ میں "اچھا اماں! سوہنی اماں! ربیاں اماں! صہباں اماں!" گانے لگے اور نمبردار نے اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے! پھر وہ کہنے لگا "ہمارے کوٹ کی آبادی تو پہلے ہی بہت کم ہے۔ گامے لوہار کے پچھلے دس سال سے بچی بچہ نہیں ہوا۔ سارے بہن بھائی ہاتھ اٹھا کر دعا کرو اللہ اس کا گھر آباد کرے۔ جو بی بیاں کوٹ وِدو چھوڑ کر اپنے سسرال چلی گئی ہیں، ان کی جگہیں بھی ویسی ہی خالی پڑی ہیں۔ بڑے بزرگ باسٹھ سال تک زندہ رہنے کی دعا کرتے ہیں اور خدا ان کی دعائیں قبول کر لیتا ہے۔ ان کی جگہیں بھی خالی ہو جاتی ہیں۔ ہم کو تو اپنے کوٹ میں جانوں کی اور انسانوں کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے کہ جتنے لوگ ہوں گے، اسی قدر بجلی کی پیداوار میں اضافہ ہو گا--- چنانچہ اونٹوں کی دوسری قطار کے خزانوں کی بھی ہمیں ضرورت نہیں۔ اس دعا کی البتہ ضرورت ہے کہ اللہ ہر گھر میں نکے نیانے کا بوٹا لگائے اور کوٹ ودو کی پھل پھلواری سلامت رکھے۔"

اونٹوں کی دوسری قطار کے ساربان نے حیرت سے نمبردار کو دیکھا اور آپس میں سر جوڑ کر کہا "احمق ہے کیا؟"

پھر نمبردار بولا "ہم محبت کے مارے لوگ ہیں اور صرف محبت کے نشے میں ہی زندہ ہیں اور کسی دوسرے نشے کا ہم کو حکم ہی نہیں۔ یہ اعداد و شمار ہمارے گاؤں یا

ہمارے ملک کے نہیں ہیں۔ یہ ہم کو شرمندہ، خوف زدہ کرنے اور ایک دوسرے کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں اور ہماری عزت نفس کم کرنے کے لئے ہمیں سنائے جاتے ہیں، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں کہ خدانخواستہ ہمارے یہاں کا ہر تیسرا آدمی ہیروئن کا نشئی ہو۔ ایک لڑکا ہمارا یونس نامی ضرور ایسا تھا جس نے ہالینڈ جا کر پہلی مرتبہ ہیروئن کا نشہ کیا تھا اور پھر وہاں کے لڑکوں سے مل کر باقاعدہ پی پینے لگا تھا۔ ہم نے دو مرتبہ اپنا آدمی اسے لینے کے لئے بھیجا بھی مگر وہ آیا نہیں۔ اب وہ وہاں روتا ہے اور ہم یہاں روتے ہیں۔ نہ ولایت والوں نے ہیروئن کا مسالا بنایا ہوتا نہ ہمارا یونس ہم سے جدا ہوتا۔ اب چالیس اونٹوں پر سونے کی اینٹوں کے صندوق لے کر ہم کیا کریں گے جب ہمارا یونس ہی ہمارے درمیان نہ رہا!"

لڑکے اور لڑکیوں نے بڑی دردناک آواز میں گانا شروع کر دیا "آ یونسا تینوں اکھیاں اڈیک دیاں!"

پھر نمبردار آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اندر سکول کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی سر جھکائے میدان سے نکل کر بستی کی طرف جانے شروع ہو گئے اور کھلے میدان میں چالیس چالیس اونٹوں کی تین قطاریں، ان کے ساربان اور امریکی سفیر اور سیکرٹری آف سٹیٹ کھڑے رہ گئے۔

جاپانی انجینئر جب بھی اس بجلی گھر کا معائنہ کرنے آتے، وہ اس پراجیکٹ کے اقتصادی فوائد کی تفصیلات تیار کرنے لگتے۔ وہ اس بجلی گھر کا تخمینہ ین میں لگاتے، پھر اس کو امریکی ڈالروں میں منتقل کرتے، امریکی ڈالروں کے پاکستانی روپے بناتے اور پاکستانی روپوؤں کو ڈوئش مارک میں بدل کر دیکھتے کہ اگر جرمن اس اختراع کا راز جان جائیں اور وہ ایسے بجلی گھروں کی تعمیر پر حاوی ہو جائیں تو ڈوئش مارک کے مقابلے میں ین کتنا گر جائے گا اور اقتصادی منڈی کی بساط پر جاپان کا مہرہ کون سے خانے میں پہنچ جائے گا!

انگریز وفد اس حیرت انگیز کارنامے کو دیکھنے جب بھی آتا، وہ اپنے ساتھ انڈیا آفس لائبریری سے پرانے گزیٹیر کی وہ کاپیاں ضرور لاتا جن میں کوٹ ودو اور کوٹ ودو کے لوگوں کا ذکر تھا اور جس پر ڈپٹی کمشنر کورنتھ لانگ لاج نے اپنے ایم فل کے مقالے

کی بنیاد رکھی تھی۔

انگریز وفد مقامی لوگوں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ اس طرح کی بجلی کی پیداوار کا ڈپٹی کمشنر لانگ لاج نے اپنے ایک خط میں ذکر کیا تھا جو اس نے ڈی ایچ لارنس کو لکھا تھا اور جو ڈی ایچ لارنس اٹلی کے اٹرسکن کھنڈرات میں گرا آیا تھا۔ اب یہ خط سویڈن کے ایک ماہر آثار قدیمہ کو پورے سوا سو سال بعد یورال کی کھدائی میں ملا تھا جہاں ڈی ایچ لارنس کی ایک محبوبہ رہتی تھی اور جس نے توتیا کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس خط میں اس بات کا وضاحت کے ساتھ ذکر تھا کہ کوٹ ودو دُنیا کا وہ واحد مقام ہے جہاں انسانوں کے درمیان تعلقات کی ایسی بے لوث گرم جوشی ہے کہ اس گرمی سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور اُس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں.... لیکن ڈپٹی کمشنر کورنتھ لانگ لاج کی اندازے کی ایک ہی غلطی تھی کہ وہ اس بجلی کو سٹیٹک الیکٹرسٹی سمجھتا تھا حالانکہ اس میں ہائی پاور ٹینشن کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔

جرمن انجینئر صرف اس بات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ ان "جنریٹروں" کی نگہداشت کس طرح سے کی جاتی ہے اور اُن کی مینٹی نینس کا کیا بندوبست ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ آگے چل کر جب ان مشینوں کی ڈیپری سی ایشن ہو گی تو پھر یہاں کے لوگ کیا کریں گے اور اگلے منصوبے کس بنیاد پر استوار کریں گے!

ایس ڈی او رضوان نے جرمن سائنس دانوں کو بتایا کہ ہم ہر جمعرات کی شام کو اپنی مشینوں کی سروس کرتے ہیں اور اُن کو نئے سرے سے نئی زندگی عطا کر کے بالکل ری کنڈیشن کر لیتے ہیں۔ جوں جوں یہ ری کنڈیشن ہوتی جاتی ہیں' ان کی ہیئت پہلے کے مقابلے میں بہتر ہو جاتی ہے اور یہ بتدریج مضبوط تر ہوتی جاتی ہیں۔

جرمن وفد جمعرات تک کے لئے رک گیا۔

جمعرات آئی اور مغرب کی نماز کے بعد حیاتو کے باڑے کے کھلے صحن میں لوگ آہستہ آہستہ آ کر جمع ہونے لگے۔ ایک طرف نوجوانوں اور مردوں کا گروہ بیٹھ گیا اور اُن کے میمنہ اور میسرہ کو بزرگوں نے ڈھانپ لیا۔ دوسری جانب ٹھیک دو گز کے فاصلے پر گاؤں کی عورتیں رنگ برنگے کپڑے پہنے' ہار سنگھار کئے ایک دوسری کے ساتھ

اٹھکیلیاں کرتیں، دائرے بنا کر دریوں پر بیٹھ گئیں۔ مولوی صاحب نے بہ آواز بلند تین مرتبہ درود شریف پڑھا اور پھر عورتوں نے "یاودودو، یا ودودو، یاودودو!" کا ورد دھیمی آواز میں شروع کر دیا۔ اُن کی دھیمی آواز کو اُجالنے کے لئے مردوں نے اُونچی آواز میں یہی ورد اُٹھایا اور سارے میں گونج کا ایک چبوترہ سا اٹھنے لگا۔ ایک ردا عورتیں لگاتیں، دوسرا ردا مرد لگاتے اور میمنہ میسرہ پر بیٹھے ہوئے بزرگ اسی ورد سے جلدی جلدی چونہ ٹیپ کر کے ایک طرف ہو جاتے۔ پھر ایک نیا ردا لگتا، اس پر دوسرا ردا اٹھتا اور ورد کا چبوترا تھوڑا سا اور بلند ہو جاتا۔

نوجوان ورد بھی کرتے جاتے تھے اور گردنیں اُٹھا اُٹھا کر اپنی محبوباؤں کو بھی دیکھ رہے تھے جو موتیوں بھری شربتی اور نیلی آنکھوں کی کھول بند کے پیچھے نہائی دھوئی نروان کی سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔

جرمن سائنس دان محسوس کر رہے تھے کہ یہ کوئی انوکھی ٹیکنالوجی ہے جس کے زور پر چلتی ہوئی مشینوں کی سروس ساتھ ساتھ کی جا سکتی ہے۔ اُنہوں نے بڑی محبت سے تیار کئے ہوئے بلیو پرنٹوں کو اب تہ کر کر کے کوٹ کی اندرونی جیبوں میں رکھنا شروع کر دیا تھا اور ایسے جنریٹر ورلڈ مارکیٹ میں سپلائی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جب سے کوٹ ودو میں یہ انوکھا بجلی گھر قائم ہوا تھا یہاں کے مردوں کی راجپوتی شان، پٹھانی غصہ اور برہمنی نفرت بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ مرد اپنے گھروں میں داخل ہونے سے پہلے زور سے کھنکھارتے، تالی بجا کر خیالی کبوتروں کو اُڑاتے اور پھر کوئی بولی ٹپہ گاتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہونے کے بجائے گلی میں آگے کو نکل جاتے۔ وہ ان گپی، لطیفے باز اور ٹھٹھولیے نوجوانوں کو وہاں سے کھسک جانے کا ٹائم دیتے تھے جو اُن کی غیر موجودگی میں گھر کی عورتوں سے گپیں لڑانے آ جاتے تھے۔

کوٹ ودو میں ہر شخص کی اپنی اپنی جائیداد، اپنا اپنا گھر اور اپنی اپنی دوکان کے ساتھ اپنی اپنی آڑھت تھی۔ کوئی شخص کسی کی ملکیت میں خواہ مخواہ کا حصہ نہیں بٹا سکتا تھا۔ پرسنل پراپرٹی کے حقوق بہت سخت تھے لیکن کھانے پینے کی اشیا پر کسی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ لڑکے سکول کو جاتے ہوئے، ہالی کھیتوں سے آتے ہوئے اور لڑکیاں گلی محلے صاف کرتے ہوئے کسی بھی گھر میں داخل ہو کر اپنی بھوک پیاس مٹا سکتے تھے

اور کوئی شے پسند آنے پر کٹوری میں تھوڑی سی نکال کر اپنے گھر میں لے جا سکتے تھے۔

اماں صوباں کی کاڑھنی کا دودھ اور بے بے نذیراں کی کڑھی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ لوگ اپنی اپنی ضرورت اور اپنی اپنی خواہش کے مطابق دودھ کے کٹورے اور کڑھی کی رکابیاں بھر بھر کر لے جاتے اور بے بے اور اماں نئے سرے سے اپنے دیگچے چڑھا دیتیں۔ اس گاؤں کے باسی کھانے پینے کی چیزوں کو سب کی ساجھی سمجھتے تھے اور اُن میں کوئی شے کسی بھی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں گردانی جاتی تھی۔

فراغت ہونے کی وجہ سے کوٹ ودو کے لوگوں میں کھیلوں کا چسکا اتنا بڑھ گیا تھا کہ سارا سارا دن نوجوان فٹ بال، ہاکی اور والی بال کھیلتے رہتے جبکہ بڑے چوسر، کیرم اور شطرنج کی بالیاں جمائے بیٹھے رہتے۔ لیکن ان کی گیمز کے رول بڑے عجیب تھے۔ آپ نہ تو مخالف ٹیم کو ہرا سکتے تھے اور نہ ہی دوسری پارٹی سے کوئی پوائنٹ جیت سکتے تھے۔

ہاکی، فٹ بال میں جب کوئی گول ہو جاتا تو دونوں ہی ٹیمیں بانہوں میں بانہیں ڈال کر بھنگڑا شروع کر دیتیں اور ساری فیلڈ کا چکر لگانے کے بعد پھر سے کھیلنا شروع کر دیتیں۔ والی بال میں گیند کو اوپر اٹھائے رکھنے کا کھیل ہوتا تھا اور ایک طرف کے کھلاڑی نٹ کے نیچے سے نکل کر دوسری فیلڈ میں داخل ہو جاتے تاکہ بال نیچے نہ گرنے پائے۔ ٹیمیں ایک دوسرے کے خلاف نہیں کھیلتی تھیں، بال کے خلاف کھیلتی تھیں۔ بال اور کشش ثقل مل کر انسانوں کو شکست دینا چاہتے تھے اور انسان اس کی مدافعت کرتے تھے۔ سات سات گھنٹے تک بال زمین پر نہیں گرتا تھا۔

اسی طرح بڑے بزرگ شطرنج میں شہ کو مات نہیں ہونے دیتے تھے۔ گھوڑا ڈھائی پٹ چل کر ادب سے کھڑا ہو جاتا تھا اور پیادہ سفلوں والی حرکتیں کر کے بادشاہ یا وزیر کو مات دینے کی کوشش کرتا تھا۔ کیرم کی ساری گوٹیاں ایک ہی رنگ کی ہوتی تھیں۔ جو جس کو پاکٹ کر لیتا تالی بج جاتی۔ یہی چوسر کا حال تھا۔ نردیں بڑھتی ضرور تھیں لیکن پٹتی نہیں تھیں، محبت اور خلوص کے ساتھ ایک دوسری کے کندھے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔

جب کینیڈا سے نیوکلیئر فزکس کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم کوٹ ودو کے

عجیب و غریب بجلی گھر کا معائنہ کرنے آئی تو اس کے ساتھ ان کا ایک اپنا انٹرپریٹر بھی تھا۔ یہ انٹرپریٹر کوٹ ودو کے کمہاروں کا لڑکا موسیٰ تھا جو لڑکپن میں گھر سے بھاگ کر بحری جہاز پر سویپر لگ گیا تھا۔ پھر وہاں سے باورچیوں اور خلاصیوں کی ماریں کھاتا کھاتا امریکہ پہنچ گیا تھا۔ تین مختلف ریاستوں کے بڑے ہسپتالوں کی لانڈریوں میں مریضوں کی گندی چادریں دھو دھو کر جوان ہوا اور شام کی کلاسوں میں داخلہ لے کر یونیورسٹی کے دروازے تک جا پہنچا۔ سالڈ سٹیٹ فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد شکاگو یونیورسٹی میں فزکس کا لیکچرار مقرر ہوا۔ وہاں تین سال تک ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام کیا اور میک گل یونیورسٹی کینیڈا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر جس طرح اس کے آباؤ اجداد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوٹ ودو چھوڑ کر سندھ چلے گئے تھے، وہ بھی امریکا چھوڑ کر ٹورونٹو میں آباد ہو گیا۔ اب وہ کینیڈا کے نیوکلیئر فزکس کے سائنس دانوں کے ہمراہ ایک ماہر کی حیثیت سے آیا تھا اور اپنی ٹیم کے لیے انٹرپریٹر کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔

جتنے دن کینیڈین سائنس دانوں کی یہ ٹیم کوٹ ودو کے گرڈ سٹیشنوں کا مطالعہ کرتی رہی اور جگہ جگہ سے زمین کھدوا کر دیکھتی رہی، کوٹ ودو کے لوگ موسیٰ کو بھی گورا انگریز ہی سمجھتے رہے۔ سرخ و سفید رنگ، سنہری بال، سنہری عینک، سیاہ ٹائی اور گرے فلیل سوٹ..... وہ کسی طرف سے بھی دیسی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انگریزی بھی ویسی ہی بولتا اور کھانا بھی انہی کے انداز میں کھاتا اور چھینک بھی ویسی ہی مارتا تھا۔

دراصل موسیٰ کے ننھیال کا تعلق سوہنی کمہارن کے قبیلے سے تھا اور اس کی پڑنانی بتایا کرتی تھی کہ اس نے اپنے لڑکپن میں سوہنی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور سوہنی کی والدہ سے قرآن پڑھا تھا۔ بغدادی قاعدہ ختم کرنے کے بعد موسیٰ کی پڑنانی سوہنی کے گھر میں ہی آ گئی تھی اور اس نے سوہنی باجی کو پیڑھی پر بیٹھ کر اپنے پیر دھوتے، مسی ملتے، سرمہ لگاتے اور بال بناتے دیکھا تھا۔ دراصل ان کے جوبن کے نشان ان کے بھرے بھرے کندھوں سے ہی شروع ہو جاتے تھے جن پر لوکہ بھر سنہری ریشمی بال ببر شیر کے نوزائیدہ بچوں کی طرح لیٹے رہتے۔ وہ اپنی گوری رنگت اور سنہرے بالوں سے بڑی تنگ تھی اس لیے سب سے زیادہ انہی کا خیال رکھتی تھی اور

انہی سے محبت کرتی تھی!

گاؤں کے تینوں گرڈ سٹیشنوں کے اردگرد اور عین وسط میں چار چار فٹ گہری کھائی کھودنے کے باوجود جب کینیڈین سائنس دانوں کو بجلی پیدا ہونے کا اصل راز معلوم نہ ہو سکا تو انہوں نے واپس جانے کی ٹھانی اور نمبردار کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔

کینیڈین سائنس دانوں کی ٹیم کی روانگی سے پہلے نمبردار نے ایک الوداعی جلسے کا اہتمام کیا جس کے مہمان خصوصی ایس ڈی او رضوان اور صاحب صدر سائنسی ٹیم کے سربراہ تھے۔ جلسہ گاہ میں کوٹ ودو کے مرد عورتیں، بچے بوڑھے، امیر غریب سبھی موجود تھے۔ سامنے والا گاؤں روالیاں، جسے کوٹ ودو چار سو چالیس وولٹ بجلی سپلائی کرتا تھا، اپنے سارے معززین کے ہمراہ پنڈال میں موجود تھا۔ حیدر والا اور موضع گلو کے چودھری بھی آئے ہوئے تھے کہ ان کو تازہ تازہ گھریلو بجلی کی سپلائی لائن ملی تھی اور وہ ہائی ٹینشن وائر ڈال کر چار سو چالیس کی سپلائی کے درخواست گزار بھی تھے۔

جب کمہاروں کے بیٹے ڈاکٹر موسیٰ نے سٹیج پر آ کر "السلام علیکم" کہا تو ایک گورے کے منہ سے یہ کلمہ سن کر سارا جلسہ تالیوں کی گونج میں ڈوب گیا۔ ڈاکٹر موسیٰ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بڑی مشکل سے تالیوں کا یہ سلسلہ رکوایا اور اپنی خوبصورت گونج دار آواز میں کہا "میرے عزیز ہم وطنو اور پیارے گرائیو!" لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتا، سارے لوگ پنڈال میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے جھپ تال پر تالیاں بجانا شروع کر دیں اور ساتھ گانا شروع کر دیا "رک جاوے ہانیاں، رہ جاوے ہانیاں!" —

ڈاکٹر موسیٰ نے دس بارہ منٹ تک مسلسل ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور واسطے دے دے کر لوگوں کو خاموش کرایا اور پھر ان کو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ جب مجمع اپنی جگہ پر بیٹھا اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان آپس کی بھنبھناہٹ ختم ہوئی تو ڈاکٹر موسیٰ نے ایڑیاں اوپر اٹھا کر بڑی گرم جوشی سے کہا "میرے پیارے بھائیو اور بہنو! میرا نام موسیٰ ہے اور میں آپ ہی کے گاؤں کا ایک فرزند ہوں۔ میرے والد جیا کمہار اور میرے تایا دونو کمہار اسی مقام پر آپ کے لیے برتن بنایا کرتے تھے اور یہیں آوی

چڑھایا کرتے تھے۔"

لوگوں نے تالیاں بجاتے ہوئے پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر موسیٰ نے ہاتھ باندھ کر انہیں منع کر دیا اور جب لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے تو ڈاکٹر موسیٰ نے کہا "میں تقریباً تیس سال بعد اپنے گاؤں واپس آیا ہوں، لیکن ایک اجنبی اور ایک غیر ملکی کی حیثیت سے۔ آج شام ہماری یہاں سے روانگی ہے اور پھر پتا نہیں قسمت یہاں دوبارہ لاتی بھی ہے یا نہیں"....

پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد کہ سارے پنڈال میں مکمل سناٹا تھا، ڈاکٹر موسیٰ نے کہنا شروع کیا "ہم لوگ آپ کی محبت سے اور آپ کی مہمان نوازی سے بے حد متاثر ہو کر جا رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارا یہ تاثر بڑے سالوں تک اسی طرح سے قائم رہے گا۔ اس تاثر کو دائمی تقویت یہ عجوبہ روزگار بجلی گھر فراہم کرتا رہے گا جو آپ لوگوں نے کوئی تھیوری بنائے بغیر یہاں پر قائم کیا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی عقل، اپنے علم اور اپنی صدیوں کی پڑھائی اور مشاہدے کی بنا پر آپ کے بجلی گھر کو پرکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ہم نے حساس ترین آلات کی مدد سے یہاں کی میگنیٹک فیلڈ کو آنکنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیں کچھ پکڑائی نہیں دیا۔ آپ نے جو کچھ ہمیں بتلایا اور سمجھایا ہے اور جو توجیہ مسٹر رضوان انجینئر نے پیش کی ہے، وہ سائنس کی کسی کتاب میں تو کیا سائنس کے کسی خواب میں بھی نہیں ملتی۔ پھر ہم نے کوانٹم تھیوری کے ہر مفروضے کو یہاں اپلائی کرنے کی کوشش کی ہے مگر اک خاص ایکویشن کے بعد معاملہ رک جاتا ہے اور آخر تک نہیں پہنچتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کوئی کاسمک راز ہے جس کی نہ تو اب تک کوئی تھیوری قائم ہو سکی ہے اور نہ ہی اُسے مفروضیات کے دائرے میں شامل کیا جا سکا ہے۔ یہ کچھ اور ہی ہے جس پر ہماری تحقیقات تو جاری رہیں گی لیکن فی الحال ہم نے اُسے ایک لاینحل حقیقت سمجھ کر اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر موسیٰ نے گھوم کر اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے کینیڈین سائنس دانوں کے گروہ کو دیکھا، ایس ڈی او رضوان پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور حاضرین کے جم غفیر کی طرف بازو پھیلا کر کہا "میرے عزیز ہم وطنو اور میرے گاؤں کے پرانے

ساتھیو! میں تمہیں اس لاثانی کامیابی پر کہ تمہارا شریک اس وقت ساری دُنیا میں اور کوئی نہیں، دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور انسانیت کی اس عظیم خدمت پر آپ کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتا ہوں..... لیکن، اور اس لیکن کے بعد میری عرضداشت آپ کے گہرے فکر اور عمیق سوچ کی متمنی ہے کہ آپ نے اپنے سارے انڈے ایک ہی ٹوکری میں ڈال دیئے ہیں اور اپنی طرز زندگی کو ایک ہی ڈگر پر ڈھال لیا ہے۔ آپ کا سارا معاشرہ ایک سائیڈ پر ہی جھول گیا ہے اور آپ لوگوں میں اختلاف کا تنوع اور فرق و تفاوت کی بوقلمونی ناپید ہو گئی ہے۔ اس وقت تو آپ کامیابی کے راکٹ پر اُوپر ہی اُوپر جا رہے ہیں اور ساری دُنیا آپ کو اپنی اپنی پگڑی سنبھال کر دیکھ رہی ہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب آپ کو اختلاف کے سہارے اور تفاوت کی آڑ کی ضرورت پڑے گی اور اُس وقت آپ اپنے گروہ میں اپنے سے مختلف لوگوں اور اپنے مزاج سے اُلٹ خاندانوں کو تلاش کریں گے۔ اس وقت جب آپ کو اپنی بقا کے لئے تضاد اور مخالفت کی شدت سے ضرورت ہو گی اور آپ کے ٹھاٹھیں مارتے انسانی گروہ میں ایک بھی متضاد نفس یا ایک بھی اپوزیشن گروپ نہیں ہوگا تو آپ کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل خود سے جاری ہو جائے گا اور آپ سنبھالے سے نہیں سنبھل سکیں گے۔

آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں کہ زندگی ساری کی ساری پوزیٹو عمل نہیں، تمام کی تمام مثبت دھار نہیں۔ اس کے لئے نیگیٹو کا ہونا بھی اشد ضروری ہے اور اس کے اندر منفیانہ کانٹوں کا پھلنا بھی لازمی اور لابدی ہے۔ جب تک آپ کے یہاں منفی قوتیں بروئے کار نہیں آئیں گی، آپ کا یہ پوزیٹو پراجیکٹ تا دیر نہیں چل سکے گا۔ جب تک آپ کے اندر from within اپوزیشن جنم نہیں لے گی اور آپ کے اندر شیطنت کا عمل جاری نہیں ہو گا، آپ کے اس صحت مند سیب کو اندر ہی اندر کیڑا لگ جائے گا اور آپ اس کے زہر کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔" ڈاکٹر موسیٰ نے ذرا رک کر کہا "آپ کی زندگی کے لئے آپ کے اندر ہی سے ایک مخالف گروہ کے پیدا ہونے کی اشد ضرورت ہے۔"

ایس ڈی او رضوان نے پہلے تو زور سے میز پر مکا مارا اور پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کینیڈین سائنس دانوں کا طائفہ حیرت کے ساتھ رضوان کا منہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر موسیٰ نے پلٹ کر کہا "بہت ممکن ہے رضوان صاحب کو میری یہ بات ناگوار گزری ہو، لیکن میں حقیقت عرض کر رہا ہوں کہ خوبی کو آگے لے جانے کے لئے اس کے ساتھ خرابی کی بھی ویسی ہی ضرورت ہوتی ہے۔" پھر اُس نے مسکرا کر کہا "خدا کو بھی اپنا کارخانہ کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ایک ابلیس کی ضرورت محسوس ہوئی.... اس ابلیس کی جس کو اس نے از خود ہر طرح کے اختیار سے نوازا اور اس کی من چاہی رعایتیں اس کے حوالے کیں۔"

ایس ڈی او رضوان نے اُونچی آواز میں کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ اور آپ سب کی تشریف آوری کا ہم پر احسان!"

ڈاکٹر موسیٰ نے پلٹ کر ایک مرتبہ پھر معنی خیز نگاہوں سے رضوان ایس ڈی او کو دیکھا اور حاضرین کی طرف منہ کر کے اُونچی آواز میں بولا "معزز خواتین و حضرات! آپ سب لوگوں کی مشترکہ کاوش سے یوں بجلی پیدا کرنا ایک بہت بڑا فنومنا ہے۔ آپ سب لوگ تو پورے کے پورے ایک ہی یقین اور ایک ہی ایمان میں داخل ہو گئے ہیں لیکن یہ پرانا زمانہ نہیں، نبیوں کا عہد نہیں۔ آپ کو اپنی سلامتی اور اپنی بقا کے لئے رویے پر نظر ثانی کرنا ہو گی اور یکتائی کے اس عمل سے باہر نکلنا ہو گا۔ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اس کے تقاضے پرانی قدروں کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ..... آپ کی محبت .... اور آپ کی مہربانی ۔"

ایک اچانک جھٹکے کے ساتھ اپنی تقریر بند کر کے ڈاکٹر موسیٰ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور لوگ کینیڈین سائنس دانوں کے وفد کو الوداع کہنے کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔

وفد کے تحفے تحائف سے لدے جہاز کی روانگی کے ٹھیک تین روز بعد ریاضی ماسٹر منظور احمد اور پرشین ٹیچر اشتیاق حسین چارپائی پر اکڑوں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے تو ماسٹر منظور نے لقمہ منہ میں روک کر کہا "ویسے کہنے کو تو کیا کہنا لیکن ڈاکٹر موسیٰ کی بات دل میں اُترنے والی ضرور تھی۔"

ماسٹر اشتیاق نے حیرت سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور لقمہ اس کے گلے میں اٹک گیا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر موسیٰ سو فیصد درست کہہ رہا تھا" ماسٹر منظور نے روٹی کے ٹکڑے میں چھوٹے آلو کو پکڑتے ہوئے کہا "لیکن اس کی یہ بات بڑی قابل توجہ تھی کہ زندگی صرف پوزیٹو لہروں کے سہارے ہی نہیں گزرتی، اس کے لئے نیگیٹو گردابوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"

ماسٹر اشتیاق اسی طرح ہکا بکا روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر بیٹھا تھا اور ماسٹر منظور کا منہ تک رہا تھا اور ماسٹر منظور کہہ رہا تھا "ہے تو بری بات..... اور اس وقت میرا دل بھی زور سے دھڑکا کہ ہم سب من حیث المجموع پورے کے پورے ایک ہی یقین میں داخل ہو گئے ہیں اور سب نے ایک رُخ ہی اختیار کر لیا ہے، لیکن بات موسیٰ کمہار کی بھی درست تھی۔ آپس کی محبت کی گرم جوشی سے بجلی تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس کی نگہداری، اس کے گذران اور اس کے بقا کے لئے نفرت، جھگڑے، جھمیلے اور باہمی مناقشت کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں منفی قدروں کو بالکل ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے اور مشکل وقت کے لئے ایک سہارا چھپا کے رکھ لینا چاہیے جیسے ہوائی جہاز کی ہر سیٹ کے نیچے ایک حفاظتی جیکٹ ہوتی ہے اور آبی جہاز کے ہینگروں پر بہت سی حفاظتی کشتیاں محفوظ ہوتی ہیں۔"

ماسٹر اشتیاق نے بے لطف ہو کر کہا "منظور صاحب! یہ باتیں تو کچھ ارتداد کی سی ہیں اور اُنہیں تشکیک نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم مرتد ہو گئے ہیں ..... کہنے والا اور سُننے والا دونوں!"

ماسٹر منظور نے ہنس کر کہا "خیر ایسی تو کوئی بات نہیں خدانخواستہ.... البتہ تفکر اور تدبر کا حکم خدا کی طرف سے بھی امر کے صیغہ میں وارد ہوا ہے۔"

یہ گفتگو کرنے کے بعد دونوں دوست سکول کے لان میں آ کر کھڑے ہو گئے جہاں ماسٹر خرم مسیح ایزل کے پیچھے نیائیوں کی بیک گراونڈ میں پرانا ہٹ پینٹ کر رہے تھے۔ ماسٹر خرم کو آئل پینٹنگ میں دو انعام مل چکے تھے.... ایک اسلام آباد میں اور دوسرا کوئٹہ کی نمائش میں۔ یہ پینٹنگ جو وہ اس وقت تیار کر رہے تھے، ایشین آئل پینٹنگز کمپی ٹیشن میں ٹوکیو جا رہی تھی اور سکول کے لڑکوں کو پختہ یقین تھا کہ ماسٹر صاحب انشاء اللہ یہ مقابلہ جیت جائیں گے۔

ماسٹر منظور اور ماسٹر اشتیاق کوئی گھنٹہ بھر تک ماسٹر خرم سے ان رنگوں کے بارے میں بحث کرتے رہے جو اس پینٹنگ میں استعمال ہو رہے تھے۔ ایک جگہ ماسٹر خرم مسیح نے سپیانون پونچھ کر وہاں چھری کے ساتھ عنابی رنگ کے ٹچ دیئے جس سے منظر اور بھی دل کش ہو گیا لیکن کونے میں سرد ئین بلو پودے کو کاٹ کر وہ میڈوگرین رنگ لگانے پر مائل نہ ہوئے۔

ابھی تینوں ماسٹر بڑی گرم جوشی کے ساتھ رنگوں کی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ موضع روالیاں کا چکی مستری اپنا سکوٹر فل سپیڈ دوڑاتا اُن کے سامنے آ کر گرا سی پاٹ پر قوس سی مارتا ہوا گھوم گیا۔ سکوٹر بھی گرا اور چکی مستری بھی لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس نے زمین سے اُٹھتے ہوئے ہکلا کر کہا "ماسٹر جی ہمارے علاقے میں وولٹیج پورے نہیں آ رہے۔ میری ایک موٹر جل گئی ہے۔"

ماسٹر منظور نے چڑ کر کہا "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے مستری جی! ہماری بجلی فلکچویٹ نہیں کرتی، آپ اپنا وولٹ میٹر تبدیل کرائیں۔"

مستری نے بڑی عاجزی سے گھگھیا کر کہا "حضور آپ خود چل کر دیکھ لیں۔ اس وقت چار سو چالیس کے بجائے دو سو اسی آ رہی ہے۔"

ماسٹر خرم نے پلیٹ پر رنگ مکس کرتے ہوئے کہا "ناممکن" اور کینوس پر موٹی موٹی ہمکیاں سی ڈالنے لگا۔

مستری نے کہا "آپ میرے ساتھ چل کر خود دیکھ لیں۔ اگر جھوٹ نکلے تو جو چور کی سزا سو میری۔" پھر اس نے اُوندھے پڑے ہوئے سکوٹر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا "خراد والوں نے بھی اپنا کام بند کر دیا ہے اور بڑا خرادیا موٹر سائیکل لے کر سیدھا ڈاک بنگلے گیا ہے تاکہ رضوان صاحب کو اطلاع دے سکے اور میں ادھر اسی لیے آ گیا ہوں کہ رضوان صاحب عام طور پر اس وقت ادھر کا چکر لگایا کرتے ہیں۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے خرادیے کی بڑی موٹر سائیکل پر رضوان صاحب آتے دکھائی دیئے۔ رضوان صاحب بڑے محتاط ڈرائیور تھے لیکن اس وقت وہ گھبرائے ہوئے اور بوکھلائے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔

موٹر سائیکل ہموار راستے پر اُونچی اُونچی پھدکیاں مار رہی تھی اور اس کے پیچھے

دھوئیں کی ایک دبیز لہر بھاگی آ رہی تھی جیسی کبھی کبھار جیٹ جہاز کی دم سے برآمد ہوتی دکھائی دیا کرتی ہے۔ اُنھوں نے موٹر سائیکل ماسٹر صاحبان کے پاس روکی، اُسے سٹینڈ پر لگانے کے بجائے ماسٹر اشتیاق صاحب کے حوالے کیا اور بھاگ کر سکول کی اُس محراب تلے چلے گئے جہاں گرڈ سٹیشن قائم کیا گیا تھا۔

وولٹ میٹر کے سامنے کھڑے ہو کر پہلے اُنھوں نے زور زور سے میٹر تھپتھپایا، پھر جیب سے رومال نکال کر اس کا شیشہ صاف کیا۔ مین سوئچ آف کر کے پھر جلدی سے اُٹھا کر آن کیا لیکن وولٹیج دو سو اسی ڈگری سے ایک درجہ بھی آگے نہ بڑھی۔ پھر اُنھوں نے جلدی جلدی چاروں فیوز چیک کئے اور ہر تار کو تسلی بخش حالت میں پا کر فکرمندی سے اپنا سر کھجانے لگے۔ پھر اسی طرح سر کھجاتے کھجاتے موٹر سائیکل ماسٹر اشتیاق کے ہاتھ سے جھپٹ کر حیاتو کے باڑے کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں بجلی گھر کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک مرتبہ پھر ماسٹر صاحبان کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر مایوسی، وحشت، ناکامی اور جگ ہنسائی کے سائے منڈلا رہے تھے اور وہ ماسٹر صاحبان کی طرف منہ کر کے اپنے آپ سے کہہ رہے تھے "کہیں کوئی بہت بڑا ڈرین ہو گیا ہے جو مجھے سمجھ نہیں آ رہا ورنہ بستی کی سپلائی کا گراف دو سو بیس وولٹ سے گر کر ایک سو نوے بانوے کبھی نہ رہ جاتا۔ کہیں کوئی گھپلا ضرور ہوا ہے، کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے۔"

پھر اُنھوں نے اپنے آپ کو مجتمع کر کے تینوں اُستادوں سے پوچھا "سکول میں کوئی ناخوشگوار واقعہ تو نہیں ہوا؟"

"ہرگز نہیں" تینوں اُستادوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کسی اُستاد نے کسی بچے کو بدنی سزا تو نہیں دی؟"

"بالکل نہیں" ماسٹر منظور نے کہا۔

"اُستادوں کے درمیان کوئی جھگڑا، کوئی اختلاف، کوئی احتجاج؟"

"ہرگز نہیں، بالکل نہیں" ماسٹر خرم مسیح نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی تبدیلی، کوئی استعفیٰ، کوئی ایڈورس رپورٹ؟"

"ہمارے سکول میں تو ایسا کچھ ہوتا ہی نہیں۔" ماسٹر اشتیاق نے کہا "ہمارا تو ایک گھرانہ ہے، ایک کنبہ ہے، ایک خانوادہ ہے۔"

"گاؤں میں کوئی قتل تو نہیں ہوا؟"

"نعوذ باللہ" تینوں استادوں نے ایک ساتھ کہا۔

"کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ؟"

"ہرگز نہیں"

"کوئی طلاق، ظلم، زیادتی؟"

"بالکل نہیں"

"پھر وولٹیج کیوں گری اور پھر ایمپیرز کیوں گھٹتے جا رہے ہیں؟"

ایس ڈی او رضوان سر پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور پھر بڑی دیر تک اسی طرح کھڑے رہے۔ اچانک وہ اپنی جگہ سپرنگ کی طرح اچھل کر پھر وولٹ میٹر کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ وولٹ میٹر بدستور دو سو اسی وولٹ دکھا رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے کھلے ہاتھ پر دائیں ہاتھ کے مکے مارتے واپس آ کر ماسٹر صاحبان کے پاس کھڑے ہو گئے۔

"کسی کے دل میں کچھ ایسا خیال آیا ہو ....." ایس ڈی او رضوان نے سوچتے ہوئے کہا "کہ جیسے یہ کام مشکل ہو..... ایک انہونی بات ہو..... ناقابل یقین ہو..... زیادہ دیر تک نہ چل سکتا ہو؟"

"اب دل کی باتیں تو خداوند ہی کو معلوم ہیں انجینئر صاحب!" ماسٹر خرم نے سنجیدگی سے کہا۔

"البتہ باہر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی" ماسٹر اشتیاق نے ماسٹر خرم کو لقمہ دیا۔

"سکول میں کسی قسم کی دشمنی، نفرت، حسد یا جلن کا جذبہ تو نہیں پیدا ہو گیا؟ میرا مطلب ہے کوئی شکر رنجی، کوئی دل شکنی..... کوئی ان بن ......؟"

"بالکل ایسی کوئی بات نہیں" ماسٹر منظور نے کہا "ایسے جذبے تو ہمارے لاشعور میں بھی موجود نہیں، پھر شعوری طور پر ہم کسی کے خلاف نفرت کا کیسے اظہار کر سکتے ہیں!"

رضوان انجینئر نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد چہرہ اُوپر اُٹھا کر پوچھا "سکول

میں کوئی نیگیٹو قسم کی بات تو نہیں ہوئی؟ کوئی اُلٹی بات؟ کوئی اُوندھی ٹیڑھی اور ..... معکوس فکر کی بات؟ کوئی بے یقینی، بے اعتباری، کم قدری یا کم دلی کی بات؟ کوئی خوف کی، خطر کی یا بیم موج کی بات ....؟"

تینوں ماسٹر چپ چاپ کھڑے رہے۔

ایس ڈی او صاحب نے کہا "آپ کے طلبا کے یا اُن کے والدین کے یا آپ کے رفقائے کار کے ذہن میں یہ تو نہیں آ گیا کہ ہم میں کوئی کمی ہے یا ہم کم مایہ اور تہی دست لوگ ہیں.... کم قیمت اور کم فہم لوگوں کا گروہ ہیں اور ہمیں ترقی یافتہ قوموں کے فرمودات کے مطابق چلنا چاہیے اور اُن پر عمل کرنا چاہیے؟ ہم میں تھوڑی سی شیطنت بھی ہونی چاہیے؟"

ماسٹر منظور نے دل ہی دل میں سوچا کہ آخر اس میں قباحت بھی کیا ہے۔ عمل چاہے کریں نہ کریں، اُن پر غور تو کرنا چاہیے۔ اگر کہیں سے کوئی اچھی بات مل رہی ہو تو اس کے جانچنے، تولنے اور آنکنے میں کیا حرج ہے؟ ایک ہی اعتقاد اور ایک ہی یقین میں پورے کے پورے داخل ہو کر اپنے پرکھوں کی طرح زندگی بسر کرنا بھی تو کوئی دانش مندی نہیں۔ جب تک فریش واٹرز اندر نہیں آئیں گے، زندگی بند ہو کر اور تنگ ہو کر بدبودار ہو جائے گی۔

ماسٹر صاحب اپنے دل میں ابھی یہ غور ہی کر رہے تھے کہ ہوسٹل کا ایک اتھلیٹ محراب کے قریب سے گزرتے ہوئے چلایا "وولٹیج اور نیچے گر گئی سر۔ ایک سو اسی سے ایک سو ساٹھ پر پہنچ گئی اور آہستہ آہستہ اور نیچے جا رہی ہے۔"

تینوں ماسٹر اور ایس ڈی او رضوان پاگلوں کی طرح اُدھر بھاگے اور وولٹ میٹر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہروں پر مایوسی کے سائے گہرے کارڈ کے شیڈ بدل رہے تھے اور کوٹ وڈو پاور ہاؤس کے وولٹ تیزی سے گرتے جا رہے تھے!